تدبرِ قرآن

۴۸

الفتح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے ربط

سابق سورہ کی آیت ۲۵ میں اہلِ ایمان سے یہ وعدہ جو فرمایا ہے کہ اگر تم کمزور نہ پڑے تو تمہی سربلند ہو گے، تمہارے حریف، ذلیل و پامال ہوں گے، اس سورہ میں اسی وعدہ کے ایفاء کی واقعاتی شہادت ہے۔ اس کا آغاز صلح حدیبیہ کے ذکر سے ہوا ہے جو فتح مکہ کی تمہید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت پر اتمام نعمت کا فتح باب ثابت ہوئی۔ اس میں فتح و غلبہ کی ان پیشین گوئیوں اور بشارتوں کا بھی حوالہ ہے جو اس امت کے باب میں تورات اور انجیل میں وارد ہوئی ہیں تاکہ اہلِ ایمان اور اہلِ کفر دونوں پر اچھی طرح واضح ہو جائے کہ یہ جو کچھ ہوا، ہو رہا ہے اور آگے ہوگا، ان میں سے کوئی بات بھی اتفاقی نہیں ہے بلکہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی سکیم میں پہلے سے طے ہے اور یہ سکیم پوری ہو کے رہے گی۔ کسی کی طاقت نہیں ہے کہ اس میں مزاحم ہو سکے۔

ب۔ سورہ کا پس منظر

اس سورہ کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس کے پس منظر کو نگاہوں کے سامنے رکھنا ضروری ہے۔ یہ نہایت مایوس کن حالات کے اندر امید کی روشنی اور شکست کے عام احساس کے اندر فتح مبین کی بشارت بن کر نازل ہوئی۔ اس نے نہایت نازک حالات کے اندر مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی اور دو سال سے زیادہ کی مدت نہیں گزری کہ اس کے ہر وعدہ اور اس کی ہر وعید کی سچائی اس طرح سامنے آ گئی کہ دوست اور دشمن کسی کے لیے بھی اس میں شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۶ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رؤیا میں یہ بشارت ہوئی کہ آپ صحابہؓ کی ایک جماعت کے ساتھ عمرہ کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے ہیں۔ اس رؤیا کی بنا پر آپ نے منادی کرا دی کہ لوگ عمرہ کے لیے تیار ہوں۔ اگرچہ قریش کے ساتھ مسلسل جنگ کی حالت قائم تھی، نہایت قوی اندیشہ تھا کہ مسلمان جماعتی حیثیت سے عمرہ کے لیے نکلے تو وہ لازماً مزاحم ہوں گے اور جنگ کی نوبت آ جائے گی لیکن مسلمانوں پر بیت اللہ سے محرومی اتنی شاق تھی کہ وہ اس خطرے سے بے پروا ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کے لیے تیار ہو گئے۔ منافقین نے جن کا ذکر پچھلی سورہ میں گزر چکا ہے، مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کی بہت کوشش کی، ڈرایا کہ جو لوگ مکہ جائیں گے ان کو گھر پلٹنا نصیب

نہیں ہوگا لیکن مسلمانوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رؤیا پر پورا اعتماد تھا اس وجہ سے تقریباً چودہ پندرہ سو صحابہؓ ہم رکابی کے لیے تیار ہوگئے۔

اس امر میں راویوں کا اختلاف ہے کہ مہینہ رجب کا تھا یا ذوقعدہ کا۔ بہرحال انہی دونوں مہینوں میں سے کوئی مہینہ تھا۔ یہ مہینے ہمیشہ سے حج وعمرہ کے لیے خاص رہے ہیں۔ اس وجہ سے اس توقع کے لیے معقول وجہ موجود تھی کہ قریش ان کا احترام ملحوظ رکھیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ نے مکّہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ذوالحلیفہ میں عمرہ کا احرام باندھا۔ قربانی کے لیے سترّ اونٹ ساتھ لیے جن کی گردنوں میں علامتِ امتیاز کے طور پر پٹے بھی ڈال دیے گئے کہ ہر دیکھنے والے پر واضح ہو جائے کہ یہ ہدی کے جانور ہیں، کوئی ان سے تعرض نہ کرے۔ جنگ کا کوئی سامان ساتھ نہیں تھا صرف تلواریں تھیں وہ بھی میانوں کے اندر۔ غرض اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا کہ قریش جنگ کا کوئی بہانہ پیدا نہ کرسکیں لیکن ان کی نخوتِ جاہلیت نے گوارا نہیں کیا کہ یہ قافلہ مکہ میں داخل ہونے پائے۔ اپنے آدمیوں کے ذریعے سے انھوں نے چھیڑ چھاڑ کے مختلف بہانے پیدا کیے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ نے ان کی کوئی شرارت کامیاب نہ ہونے دی۔ حدیبیہ پہنچ کر آپ نے ایک شخص کو قریش کے لیڈروں کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ آپ صرف عمرہ کے قصد سے آئے ہیں، اس کے سوا کوئی اور غرض نہیں ہے لیکن انھوں نے قاصد کو قتل کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ بڑی مشکل سے ایک دوسرے گروہ کی مداخلت سے اس کی جان بچی۔ اس کے بعد آپ نے اپنے خاص سفیر حضرت عثمانؓ کو بھیجا۔ انھوں نے بھی قریش کو اطمینان دلانے کی پوری کوشش کی لیکن قریش اپنی ہٹ پر قائم رہے۔ البتہ حضرت عثمانؓ کے ساتھ انھوں نے کوئی بدسلوکی نہیں کی بلکہ عزت سے پیش آئے اور یہ پیش کش کی کہ اگر وہ تنہا طواف کرنا چاہیں تو کر لیں لیکن حضرت عثمانؓ نے ان کی پیش کش رد کر دی کہ رسول اللہ صلعم کے بغیر وہ طواف کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اسی حیص بیص میں حضرت عثمانؓ کی واپسی میں کچھ دیر ہوگئی اور ادھر مسلمانوں کے کیمپ میں یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیے گئے۔ اس افواہ سے قدرتی طور پر مسلمانوں کے اندر ایک شدید قسم کا اشتعال پیدا ہوگیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس سے نہایت متاثر ہوئے۔ آپ نے لوگوں کو بیعتِ جہاد کی دعوت دی کہ اب ہم قریش سے جنگ کریں گے، تحت یا تختہ! صحابہؓ بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔ جب قریش کو خبر پہنچی کہ مسلمان مرنے مارنے پر تل گئے ہیں تو انھوں نے سہیل بن عمرو کی قیادت میں ایک وفد صلح کی بات چیت کے لیے بھیجا۔ اس وفد نے قریش کی آن رکھنے کے لیے اس بات پر بہت اصرار کیا کہ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں، اگلے سال عمرہ کے لیے آئیں، اہلِ مکہ تین دن کے لیے شہر خالی کر دیں گے تاکہ کسی تصادم کا اندیشہ نہ رہے۔ اسی طرح اس بات پر بھی اصرار کیا کہ اگر کوئی ہمارا آدمی بھاگ کر مسلمانوں کے پاس چلا جائے تو مسلمان اس کو واپس کرنے کے پابند ہوں گے اور اگر مسلمانوں کا کوئی آدمی ہمارے پاس آجائے تو ہم اس کو واپس کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔ صحابہؓ یہ شرطیں قبول کرنے پر کسی طرح بھی راضی نہیں تھے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارۂ غیبی کے تحت یہ مان لیں اور مندرجہ ذیل شرائط پر ایک معاہدہ طے پا گیا۔

۱۔ دس سال تک فریقین کے درمیان جنگ بند رہے گی۔ اس دوران میں کوئی فریق بھی ایک دوسرے کے خلاف

کوئی خفیہ یا علانیہ کارروائی نہ کرے گا۔

۲۔ اس دوران میں قریش کا کوئی آدمی اگر بھاگ کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جائے گا تو وہ اسے واپس کر دیں گے اور اگر مسلمانوں میں سے کوئی آدمی قریش کے پاس آجائے گا تو وہ اس کو واپس کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔

۳۔ قبائل عرب میں سے جو قبیلہ بھی چاہے فریقین میں سے کسی کا حلیف بن کر اس معاہدہ میں شامل ہو سکتا ہے۔

۴۔ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔ آئندہ سال وہ عمرہ کے لیے آئیں۔ تین دن تک وہ مکہ میں ٹھہر سکتے ہیں۔ اسلحہ میں سے ہر شخص صرف ایک تلوار میان میں لا سکتا ہے۔ ان تین دنوں میں اہل مکہ ان کے لیے شہر خالی کر دیں گے تاکہ کسی تصادم کا کوئی اندیشہ نہ رہے۔

ان میں سے دو شرطیں، جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا، مسلمانوں کو شدید ناگوار تھیں۔ لوگ ان کو قبول کرنا اعتراف شکست کے ہم معنی سمجھتے تھے اور کسی طرح بھی راضی نہیں تھے کہ کوئی بات قریش سے دب کر مانی جائے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے جذبات کا اظہار اس موقع پر ایسے تند الفاظ میں کیا کہ زندگی بھر ان کو اس کا پچھتاوا رہا۔ صلح نامہ طے پا جانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ لوگ قربانی کر کے سر منڈوائیں اور عمرہ سے فارغ ہوں۔ لیکن لوگوں کی افسردگی و کبیدگی کا یہ عالم تھا کہ ایک شخص بھی اپنی جگہ سے نہ اٹھا۔ بالآخر حضورؐ نے خود پہل کی۔ جب لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ اب فیصلہ میں کسی تبدیلی کی گنجائش باقی نہیں رہی تب بادلِ نخواستہ لوگ اٹھے اور عمرہ سے فارغ ہوئے۔ واپسی کے وقت لوگوں کا عام احساس یہ تھا کہ ہم ناکام واپس ہو رہے ہیں اس وجہ سے قدرتی طور پر بہت سے لوگوں کے ذہن میں یہ سوال بھی تھا کہ نبی کی رؤیا سچی ہوتی ہے تو اس رؤیا کا کیا بنا جو حضورؐ نے دیکھی اور جس کی بنا پر گھر سے نکلے! —— یہ حالات تھے جن میں یہ سورہ نازل ہوئی اور جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، فتحِ مبین کی بشارت بن کر نازل ہوئی۔ رہا یہ سوال کہ جس چیز کو عام مسلمانوں نے اپنی شکست تصور کیا وہ 'فتحِ مبین' کس طرح بنی تو اس کا جواب سورہ کی تفسیر سے سامنے آئے گا۔ پہلے سورہ کے مطالب پر ایک اجمالی نظر ڈال لیجیے۔

ج۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۷) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کی بشارت کہ صلح حدیبیہ کی شکل میں تمھیں ایک فتح مبین حاصل ہوئی ہے۔ یہ فتح مبین تمہید ہے اس بات کی کہ اب وہ وقت قریب ہے جب فتح مکہ کی صورت میں تمھیں کفار پر کامل غلبہ حاصل ہو گا، اللہ تعالیٰ اپنے دین کی نعمت تم پر تمام کرے گا اور تم اپنے مشن کی ذمہ داریوں سے فارغ ہو کر اپنے رب کی کامل اور ابدی خوشنودی حاصل کرو گے۔ اس مہم کا یہ پہلو بھی نہایت مبارک ہے کہ اہل ایمان کے لیے اس نے ایمان میں افزونی اور حصولِ جنت کی راہ کھولی جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک فوزِ عظیم ہے اور ان منافقین و منافقات کے لیے یہ خدا کے غضب اور اس کی لعنت کا سبب بنی جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیوں میں مبتلا رہے اور اس حقیقت کو نہ پا سکے کہ آسمانوں اور زمین کی تمام فوجیں خدا ہی کے حکم کے تحت ہیں اور وہ اپنے علم و حکمت کے تحت

جس طرح چاہے ان سے کام لیتا ہے اور لے سکتا ہے۔

(۸-۱۰) عام مسلمانوں کو خطاب کر کے اس حقیقت کی وضاحت کہ رسول اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک شاہد اور بشیر و نذیر ہو کر آتا ہے۔ لوگوں کا فرض ہے کہ اس پر ایمان لائیں، اس کی توقیر کریں، تمام مہمات میں اس کے ساتھی اور مددگار بنیں۔ جو لوگ اس کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں وہ در حقیقت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ اگر وہ اس بیعت کا حق ادا کریں تو اس کا اجر بہت بڑا ہے اور اگر اس کا حق ادا نہ کریں تو یاد رکھیں کہ اس میں انہی کی تباہی ہے۔ اللہ کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔

(۱۱-۱۶) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آگاہی کہ اس موقع پر جو منافقین پیچھے بیٹھ رہے اب وہ تمہارے پاس یہ درخواست لے کر آئیں گے کہ گھر بار کی ذمہ داریوں نے ان کو مجبور رکھا اس وجہ سے وہ معافی اور پیغمبر کی دعائے مغفرت کے سزاوار ہیں۔ ان کو بتا دیجیو کہ تمہارے نہ اٹھنے کی وجہ تمہارا یہ گمان تھا کہ اب کے مسلمانوں اور پیغمبر کو گھر پلٹنا نصیب نہ ہوگا تو تم نے اپنے اس گمان کے باعث خود اپنی تباہی کا سامان کیا۔ اب تمہارا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے۔ وہی جس کو چاہے گا معاف کرے گا، جس کو چاہے گا سزا دے گا۔

ان منافقین کے بارے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ یہ لوگ جب دیکھیں گے کہ کسی مہم میں بغیر کسی خطرے کے لقمۂ تر ہاتھ آنے والا ہے تو یہ پورا زور لگائیں گے کہ انھیں بھی ساتھ نکلنے کی اجازت دی جائے لیکن ان کو ہرگز اجازت نہ دی جائے۔ ان کو آگاہ کر دیا جائے کہ آگے ایک طاقتور دشمن سے مقابلہ ہونے والا ہے اگر اس موقع پر تم نکلے تو خیر ہے اور اگر اس وقت بھی اسی طرح بہانہ سازی کر کے بیٹھ رہے تو تمہارے لیے بھی وہی عذاب مقدر ہے جو کفار کے لیے ہے۔

(۱۷) ان معذورین کا بیان جن کی جنگ سے غیر حاضری نفاق پر محمول نہیں ہوگی بشرطیکہ وہ دل سے اللہ اور رسول کے فرمانبردار رہیں۔

(۱۸-۲۱) ان جاں نثاروں کا بیان جنھوں نے بیعتِ رضوان میں شرکت کی۔ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی، فتوحات، غنیمت اور فتح مکہ کی بشارت۔

(۲۲-۲۵) اس امر کا بیان کہ حدیبیہ کے موقع پر قریش جنگ کرتے تو منہ کی کھاتے مسلمانوں کے غلبہ کے پہلو کی طرف اشارہ۔ قریش کی کھلی ہوئی اخلاقی و مذہبی شکست۔ قریش کی معصیّت کے باوجود مسلمانوں کو جنگ کی اجازت نہ دینے کی حکمت۔

(۲۶) قریش کی اخلاقی شکست کے پہلو بہ پہلو مسلمانوں کی طرف سے اخلاقی فتح کا جو مظاہرہ ہوا اس کی طرف اشارہ حمیّتِ جاہلیت کے بالمقابل مسلمانوں نے تقویٰ اور اللہ و رسول کی اطاعت کی جو شان نمایاں کی اس کا حوالہ۔

(۲۷) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رؤیا کی تصدیق۔ اس کی تعبیر کے ظہور میں جو تاخیر ہوئی اس کی حکمت۔

(۲۸-۲۹) اسلام کا غلبہ تمام ادیان پر یقینی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کی تصویر تورات میں اور حق کے تدریجی غلبہ کی تمثیل انجیل میں۔

سُوْرَةُ الْفَتْحِ (۴۸)

مَدَنِيَّةٌ ——— اٰيات: ۲۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ﴿۱﴾ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۙ﴿۲﴾ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ﴿۳﴾ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ؕ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ﴿۴﴾ لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ۙ﴿۵﴾ وَّيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۶﴾ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۷﴾

ترجمۂ آیات ۱-۷

بے شک ہم نے تم کو ایک کھلی ہوئی فتح عطا فرمائی کہ اللہ تمھارے تمام اگلے اور پچھلے گناہوں کو بخشے، تم پر اپنی نعمت تمام کرے، تمھارے لیے ایک بالکل سیدھی راہ کھول دے اور تمھیں اپنی ناقابلِ شکست نصرت سے نوازے۔ ۱-۳

وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں پر طمانیت نازل فرمائی تاکہ ان کے ایمان میں مزید ایمان کی افزونی ہو اور آسمانوں اور زمین کی تمام فوجیں اللہ ہی کی ہیں اور اللہ علیم و حکیم ہے تاکہ اللہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایسے باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اور تاکہ ان سے ان کے گناہوں کو جھاڑ دے اور اللہ کے نزدیک بڑی کامیابی یہی ہے! ۴-۵

اور تاکہ اللہ سزا دے منافق مردوں اور منافق عورتوں، مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو جو اللہ کے باب میں بُرے گمان کرتے رہے، برائی کی گردش انہی پر ہے! اور ان پر اللہ کا غضب ہوا اور ان پر اس نے لعنت کی اور ان کے لیے اس نے جہنم تیار کر رکھی ہے اور وہ نہایت بُرا ٹھکانا ہے! اور اللہ ہی کی ہیں آسمانوں اور زمین کی فوجیں اور اللہ غالب و حکیم ہے۔ ۶-۷

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا (۱)

'فتح مبین' سے یہاں مراد معاہدۂ حدیبیہ ہے۔ اس کے سوا کسی اور فتح کو مراد لینے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ اس کو فتح مبین قرار دینے کے متعدد پہلو بالکل واضح ہیں۔ مثلاً

ایک یہ کہ یہ پہلا موقع ہے کہ قریش نے علانیہ بیت اللہ پر مسلمانوں کا حق تسلیم کیا اور یہ تسلیم کرنا بطور احسان نہیں بلکہ مسلمانوں سے دب کر ہوا۔ آگے آیت ۲۴ سے واضح ہو گا کہ اگر معاہدہ نہ ہوتا اور

جنگ چھڑتی تو مسلمانوں کی فتح یقینی تھی ۔ قریش نے صورتِ حال کا اچھی طرح اندازہ کر لیا تھا اس وجہ سے وہ معاہدہ کے دل سے خواہش مند تھے ۔ البتہ اپنی ناک ذرا اونچی رکھنے کے لیے یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اسی سال عمرہ کرنے پر اصرار نہ کریں بلکہ آئندہ سال آئیں ۔ مسلمانوں کو اس بات پر راضی کرنے کے لیے انھوں نے بہت بڑی رشوت بھی دی کہ تین دن کے لیے وہ شہر بالکل خالی کر دیں گے تا کہ کسی تصادم کا کوئی اندیشہ نہ رہے ۔ قریش کی طرف سے یہ پیش کش کوئی معمولی بات نہیں تھی ۔

دوسرا یہ کہ قریش نے اس معاہدے کی رُو سے مسلمانوں کو اپنے برابر کی ایک حریف قوت اعرب میں تسلیم کر لیا ۔ ان کی نظر میں مسلمانوں کی حیثیت اب باغیوں اور غدّاروں کی نہیں رہی تھی ، جیسا کہ وہ [illegible] اب تک کہتے رہے تھے ، بلکہ مساوی درجے کی ایک سیاسی قوت کی ہو گئی چنانچہ انھوں نے علانیہ ان کے لیے یہ حق تسلیم کر لیا کہ عرب کے جو قبائل ان کے حلیف بننا چاہیں وہ ان کو اپنا حلیف بنا سکتے ہیں ۔

تیسرا یہ کہ قریش نے مسلمانوں کی جنگی صلاحیت کا لوہا بھی اس حد تک مان لیا کہ خود اصرار کر کے معاہدے میں دس سال کے لیے جنگ بندی کی شرط رکھوائی ۔

چوتھا یہ کہ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ اور مسلمانوں کو جنگ کی اجازت جو نہیں دی تو اس کی وجہ مسلمانوں کی کوئی کمزوری نہیں تھی بلکہ صرف یہ تھی کہ مکہ میں بہت سے ظاہر اور مخفی مسلمان تھے جو وہاں سے ابھی ہجرت نہیں کر سکے تھے ، اندیشہ تھا کہ جنگ کی صورت میں ان کو خود مسلمانوں کے ہاتھوں نقصان پہنچ جائے گا ۔

غرض اس کے ایک فتح مبین ہونے کے گوناگوں پہلو واضح تھے جو مسلمانوں سے مخفی نہیں ہو سکتے تھے لیکن قریش نے اپنی حمیتِ جاہلیت کا مظاہرہ کچھ اس طرح کیا اور بعض واقعات نہایت اشتعال انگیز مثلاً ابو جندل کا واقعہ ـــــ اس دوران میں ایسے پیش آ گئے کہ مسلمانوں کے اندر عام احساس یہ پیدا ہو گیا کہ یہ معاہدہ دب کر کیا جا رہا ہے ۔ جذبات کے ہیجان میں لوگ اس کے ہر پہلو پر غور کر کے یہ اندازہ نہ لگا سکے کہ اس معاہدے کی رُو سے انھوں نے کیا پایا اور کیا کھویا ۔ اس سورہ نے جب اصل حقائق کی طرف توجہ دلائی تب لوگوں کو محسوس ہوا کہ فی الواقع انھوں نے معاہدے کے مضمرات سمجھنے میں غلطی کی اور جب اس کے نتائج سامنے آئے تو ہر شخص نے کھلی آنکھ سے دیکھ لیا کہ فی الواقع یہی معاہدہ فتح مکہ کی تمہید ثابت ہوا ۔

لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ وَيَنصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا (۲-۳)

اس فتح مبین کے چند نتائج

'ل' یہاں غایت و نہایت کے مفہوم میں ہے یعنی اللہ نے یہ فتح مبین جو عنایت فرمائی ہے یہ تمہید ہے جو منتہی ہو گی مندرجہ ذیل باتوں پر جن سے اللہ تعالیٰ تمھیں سرفراز فرمانے والا ہے ۔

ایک یہ کہ اب وہ وقت قریب ہے کہ تم اپنے مشن کی ذمہ داریوں سے فارغ ہو جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ تمھیں تمھارے اگلے پچھلے تمام گناہوں کو معاف کر کے اپنی رحمت سے نوازے گا۔

دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی نعمت تمام کرنے والا ہے۔

تیسری یہ کہ ہدایت کی صحیح راہ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے کھول دے گا۔

چوتھی یہ کہ تمھیں اللہ تعالیٰ ایسا غلبہ عطا فرمائے گا جس کو چیلنج نہیں کیا جا سکے گا۔

یہ چاروں باتیں یہاں اجمال کے ساتھ مذکور ہوئی ہیں۔ ان کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضرورت ہے کہ قرآن کے نظائر کی روشنی میں ان کی وضاحت کی جائے۔

لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ: یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی بشارت دی گئی ہے کہ اس فتح مبین کے بعد فریضۂ رسالت کی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہونے کا وقت آپ کے لیے قریب آگیا ہے۔ یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ مختلف اسلوبوں سے آیا ہے۔ مثلاً سورۂ نصر میں فرمایا ہے۔

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا (۱-۳)	جب اللہ کی مدد اور فتح ظاہر ہو جائے اور تم دیکھو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو اور اس سے مغفرت مانگو، بے شک اللہ بڑا ہی توبہ قبول فرمانے والا ہے۔

اس سورہ میں فتح و غلبہ کی بشارت کے ساتھ یہ اشارہ بھی ہے کہ اس کے بعد فریضۂ رسالت کی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہونے کا وقت آپ کے لیے قریب آجائے گا لیکن صاف الفاظ میں اس کی بشارت دینے کے بجائے اس کے لیے تیاری کرنے کی ہدایت فرمائی گئی کہ تسبیح، نماز اور استغفار سے اس کے لیے تیاری کرو۔ آیت زیر نظر میں یہی مضمون موقع و محل کے تقاضے سے نہایت واضح بشارت کے اسلوب میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ فتح مبین جو تمھیں حاصل ہوئی ہے اس کے بعد اب وہ وقت قریب ہے کہ تمھارے رب نے جو ذمہ داری تم پر ڈالی تھی اس سے فارغ فرمائے گا اور نہایت سرخروئی و سرفرازی کے ساتھ اس طرح فارغ فرمائے گا کہ تمھارے تمام اگلے پچھلے گناہ بخش دے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سب سے بڑی بشارت کوئی ہو سکتی تھی تو لاریب یہی ہو سکتی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جس عظیم مشن پر مامور فرمایا تھا اس سے آپ کو اس طرح فارغ فرمائے کہ اس کے متعلق کوئی بھی چھوٹی یا بڑی مسئولیت آپ پر باقی نہ رہے بلکہ یہ اطمینان ہو جائے کہ آپ نے یہ فریضہ ٹھیک ٹھیک اپنے رب کی مرضی کے مطابق انجام دے دیا۔ اس ٹکڑے میں آپ کو خوشنودی کا یہی پروانہ عطا ہوا ہے

اور ظاہر ہے کہ اس سے بڑا پروانہ کوئی اور آپ کے لیے نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی کی شکرگزاری نے آخری دور میں جب آپ کی عبادت کی سرگرمیوں میں بہت اضافہ کر دیا تو لوگ آپ سے سوال کرتے کہ یا رسول اللہ، آپ کے تو تمام اگلے پچھلے گناہ بخشے جا چکے ہیں تو آپ عبادت میں اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ آپ اس کا جواب دیتے کہ اَفَلَا اَکُوْنُ عَبْدًا شَکُوْرًا (کیا میں اپنے رب کا شکرگزار بندہ نہ بنوں؟)

انبیاء علیہم السلام سے کس طرح کے گناہ صادر ہوتے ہیں

یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جس 'ذنب' کی نسبت کی گئی ہے اس سے متعلق یہ وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے اتباعِ ہوا کی نوعیت کے گناہ تو کبھی صادر نہیں ہوئے لیکن اقامتِ دین کی جدوجہد میں، نیک دواعی کے تحت، کبھی کبھی ان سے بھی ایسی باتیں صادر ہو گئی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے ان کی گرفت فرمائی ہے۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس منافقین آتے اور کوئی بہانہ پیدا کر کے یہ چاہتے کہ ان کو جہاد میں شرکت سے رخصت دی جائے۔ آپ کو علم ہوتا کہ یہ لوگ محض بہانہ سازی کر رہے ہیں لیکن کریم النفسی کے سبب سے آپ ان کو رخصت دے دیتے کہ ان کا فضیحتا نہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ نرمی اگرچہ آپ کی کریم النفسی کا نتیجہ تھی، اس میں اتباعِ ہوا کا کوئی شائبہ نہیں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر آپ کی گرفت فرمائی اس لیے کہ نبی ہر معاملے میں حق و عدل کی کسوٹی ہوتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ شریفانہ سلوک کرنے کے معاملے میں بھی اس حد سے متجاوز نہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے شریفانہ سلوک کے لیے ٹھہرا دی ہے۔

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی اپنی قوم کے سرداروں کی دلداری، اس خیال سے، زیادہ فرماتے کہ اگر یہ لوگ ایمان لائیں گے تو یہ دعوت کی تقویت و ترقی کا ذریعہ بنیں گے۔ یہ چیز بجائے خود کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ دین کی مصلحت کا ایک نہایت اہم تقاضا ہے لیکن اگر یہ اتنی زیادہ ہو جائے کہ اس سے اصلی حق داروں کے حق سے غفلت ہونے لگے یا نااہلوں کی رعونت میں اس سے اضافہ ہونے لگے تو اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو اس سے روک دیتا ہے۔ سورۂ عبس میں ایک نابینا کا جو واقعہ بیان ہوا ہے وہ اسی نوعیت کا ہے۔

اسی طرح کے واقعات دوسرے انبیاء کی زندگیوں میں بھی پیش آئے جن کی وضاحت، ہم نے اپنی اس کتاب میں ان کے محل میں کی ہے۔ آیت زیرِ بحث میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جس گناہ کی نسبت کی گئی ہے اس کی نوعیت یہی ہے۔ اس طرح کی تمام باتوں کے متعلق آپ کو بشارت دے دی گئی کہ یہ ساری چیزیں آپ کو بخش دی جائیں گی۔

'اگلے اور پچھلے' کے الفاظ اصلاً تو احاطہ کے مفہوم پر دلیل ہیں۔ لیکن ان سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس بشارت سے پہلے کی غلطیاں بھی معاف اور اس کے بعد بھی اگر کوئی غلطی ہوئی تو وہ بھی اسی حکم میں داخل ہے۔ اس کے لیے کسی نئی بشارت کی ضرورت نہیں ہے۔

وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ۔ یہ نعمت دین کے اتمام اور اس کی تکمیل کی بشارت ہے۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر جب اس نعمت کی تکمیل ہو گئی تو یہ اعلان کر دیا گیا کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدۃ: ۳) (اب میں نے تمہاری رہنمائی کے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا، تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کیا)۔

تکمیلِ دین کی نعمت کا ثمرہ

وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا۔ یہ تکمیلِ دین کی نعمت کا ثمرہ بیان ہوا ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ تمہیں اس صراطِ مستقیم کی ہدایت بخشے گا، جس سے شیطان نے لوگوں کو ہٹا دیا تھا۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے خلق کی ہدایت کے لیے جو دین نازل فرمایا تھا یہود اور نصاریٰ نے بھی اس کو ضائع کر دیا تھا اور اہلِ عرب نے بھی، حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کے تعمیر کردہ مرکزِ توحید کو ایک بت خانہ کی شکل میں تبدیل کر کے، اصل نشانِ راہ گم کر دیا تھا۔ جس سے خدا تک پہنچانے والی سیدھی راہ بالکل ناپید ہو چکی تھی۔ یہ راہ خلق کے لیے از سرِ نو اس وقت باز ہوئی ہے جب اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اپنے دین کی تجدید و تکمیل فرمائی ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعمیر کردہ مینارۂ توحید کفر کے نرغہ سے نکل کر اپنے اصل ابراہیمی جمال و شان میں نمایاں ہوا ہے۔ اس ٹکڑے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اب دین بھی نکھر کر سامنے آ جائے گا اور وہ مرکزِ نور بھی بے نقاب ہو جائے گا جو ہدایت کی اصل شاہراہ کی طرف رہنمائی کے لیے تعمیر ہوا تھا۔

یہاں یہ بشارت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے دی گئی ہے۔ یہی بشارت اسی سورہ کی آیت ۲۰ میں تمام مسلمانوں کو مخاطب کر کے دی گئی ہے۔ وہاں ان شاء اللہ ہم اس پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

'نصرِ عزیز' کا صحیح مفہوم

وَيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا۔ نَصْرًا عَزِيْزًا سے مراد کفر کے مقابل میں ایسی فتح و نصرت ہے جس کو چیلنج نہ کیا جا سکے۔ اس طرح کی نصرت ظاہر ہے کہ اسی شکل میں آپ کو حاصل ہو سکتی تھی جب کفر کا زور بالکل ہی ٹوٹ جائے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ جب قریش کا زور بالکل ختم ہو جائے اور بیت اللہ مسلمانوں کی تحویل میں آ جائے۔ اب تک مسلمانوں کو قریش کے مقابل میں جو کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں وہ بھی اہم تھیں لیکن ایسی نہیں تھیں کہ ان کو چیلنج نہ کیا جا سکے۔ قریش جب تک مکہ پر مسلط تھے اس وقت تک وہ بہر حال ایک طاقت تھے لیکن واقعۂ حدیبیہ نے ان کی یہ طاقت متزلزل کر دی اور وہ وقت اب دور نہیں رہ گیا تھا کہ ان کے اقتدار کی یہ کہنہ عمارت ایک ہی جھٹکے میں زمین بوس ہو جائے۔ یہ اسی نصرِ عزیز کی بشارت دی گئی ہے۔ عزیز کے معنی غالب و مقتدر کے ساتھ منیع کے بھی ہیں یعنی جس تک کسی کی پہنچ نہ ہو سکے۔

ترتیبِ بیان کی ایک بلاغت

یہاں ان بشارتوں کے ظہور کی ترتیب میں جو بلاغت ہے وہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ جو چیز سب سے

پہلے ظہور میں آنے والی ہے اس کا ذکر سب سے آخر میں ہوا اور جو چیز سب کا خلاصہ ہے اور سب سے آخر میں ظاہر ہوگی اس کا ذکر سب سے پہلے ہوا۔ یہ ترتیب نزولی ہے۔ یعنی بیانِ مطالب میں نیچے سے اوپر چڑھنے کی نہیں بلکہ اوپر سے نیچے اترنے کی ترتیب اختیار فرمائی گئی ہے۔ اس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ یہ موقع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت دینے کا تھا۔ فتح مکہ کی بشارت بھی اگرچہ اہم بشارت تھی لیکن اس سے بھی بڑھی بلکہ سب سے بڑی بشارت آپ کے لیے یہ تھی کہ وہ انعامِ اخروی آپ کے سامنے رکھ دیا جائے جو آپ کو ملنے والا ہے اور جس کے ملنے میں اب زیادہ دیر نہیں رہ گئی ہے۔ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ۭ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (۴)

وعدۂ نصرت کی دلیل

اُوپر والی آیت میں جس نصرت کا وعدہ فرمایا گیا ہے یہ اس کی دلیل ارشاد ہوئی ہے کہ یہ اللہ ہی کی نصرت کا کرشمہ ہے کہ اس نے مومنوں کے دلوں میں یہ حوصلہ پیدا کیا کہ وہ تمہاری دعوت پر عمرہ کے لیے تمھارے ہم رکاب ہو گئے تاکہ جو دولتِ ایمان ان کو حاصل تھی اس پر وہ اپنی اس حوصلہ مندی اور نبی کی رفاقت سے مزید اضافہ کرلیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ سفر اگرچہ عمرہ کے لیے تھا لیکن اس کا ارادہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت خطرناک حالات میں فرمایا تھا۔ قریش سے برابر جنگ کی حالت قائم تھی اور اب تک ان کے حوصلہ کا یہ عالم تھا کہ وہ برابر اُمنڈ اُمنڈ کر مدینہ پر حملے کر رہے تھے۔ ایسی حالت میں کسی طرح بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ مسلمان جماعتی حیثیت سے عمرہ کے لیے جائیں گے تو وہ بغیر مزاحمت کے آسانی سے ان کو مکہ میں داخل ہونے دیں گے۔ چنانچہ آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا کہ منافقین اسی بنا پر یہ گمان رکھتے تھے کہ مسلمان موت کے منہ میں جا رہے ہیں اور اب کے اس سفر سے ان کو گھر پلٹنا نصیب نہیں ہوگا۔ ایسے حالات کے اندر چودہ پندرہ سو صحابہؓ کا اپنے گھروں کو چھوڑ کر، ڈھائی سو میل دور کے سفر کے لیے اٹھ کھڑے ہونا اور وہ بھی بالکل غیر مسلّح، کوئی معمولی بات نہیں تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان میں برکت دی، ان پر خاص اپنے پاس سے عزم و حوصلہ اتارا اور وہ اس سفر کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مطلب یہ ہے کہ جس خدا نے تمھارے ساتھیوں کو اس موقع پر یہ حوصلہ عطا فرمایا وہ آگے کے مراحل میں بھی ان کی حوصلہ افزائی فرمائے گا اور اللہ تم سے جس 'نصرِ عزیز' کا وعدہ فرما رہا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔

اہلِ ایمان کو جو آزمائشیں پیش آتی ہیں وہ ان کے ایمان کی جانچ کے لیے پیش آتی ہیں

'لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ' میں دین کی اس حکمت کی طرف اشارہ ہے کہ اس دنیا میں اہلِ ایمان کو جو آزمائشیں پیش آتی ہیں وہ درحقیقت ان کے ایمان کی جانچ کے لیے پیش آتی ہیں۔ اگر وہ اس جانچ میں پورے اترتے جاتے ہیں تو ان کے ایمان کی قوت میں مزید اضافہ ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ ان کو نفسِ مطمئنہ کی بادشاہی حاصل ہو جاتی ہے اور اگر وہ فیل ہو جاتے ہیں اور برابر فیل ہی ہوتے رہتے ہیں تو بالآخر

ان کا نورِ ایمان بالکل ہی بجھ جاتا ہے۔

ایمان کے گھٹنے بڑھنے سے متعلق امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کا صحیح پہلو

اس سنتِ الٰہی کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں اور اس سنت کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ ایمان ایک گھٹنے بڑھنے والی چیز ہے۔ اگر وہ کوئی جامد شے ہوتا تو اس امتحان کی ضرورت نہیں تھی۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ سے یہ بات جو منسوب کی جاتی ہے کہ وہ ایمان کے گھٹنے بڑھنے کے قائل نہیں تھے تو اس کا ایک خاص محل ہے۔ اس سے ان کی مراد وہ قانونی ایمان ہے جس پر ایک اسلامی ریاست میں ایک مسلمان کے شہری حقوق قائم ہوتے ہیں، نہ کہ وہ ایمان جس پر آخرت کے مدارج و مقامات مبنی ہیں۔ قانونی فقہی ایمان کے اعتبار سے ہر مسلمان جو ضروریاتِ دین کا قائل ہے، برابر ہے اور اسلامی ریاست سب کے ساتھ مسلمان ہی کی حیثیت سے معاملہ کرے گی۔ اس پہلو سے ایک بدوی اور ایک شہری میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ رہا آخرت کا معاملہ تو اس کا انحصار حقیقی ایمان پر ہے جس کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہو سکتا ہے اور وہی اس کا فیصلہ فرمائے گا۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مسلک بجائے خود ہمارے نزدیک بالکل صحیح ہے لیکن اس کی وکالت بھی بالکل غلط طریقہ پر کی جاتی ہے اور اعتراض کرنے والوں نے ان کی بات سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

جو رسول کی مدد کرتے ہیں وہ اپنے لیے کسبِ سعادت کی راہ کھولتے ہیں

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تمہاری رفاقت کے لیے جو آمادہ کر دیا تو یہ ان پر اس نے احسان فرمایا کہ وہ اپنی اس نیکی سے اپنے ایمان پر مزید ایمان کا اضافہ کریں ورنہ وہ اپنے رسول اور اپنے دین کی نصرت کے لیے کسی کا محتاج نہیں ہے۔ آسمانوں اور زمین کی تمام قوتیں اور تمام فوجیں اللہ ہی کے تصرف میں ہیں، وہ جب چاہے کفار سے اپنی ان فوجوں کے ذریعہ انتقام لے سکتا ہے لیکن اس نے اہل ایمان کو اپنے رسول کی نصرت کی دعوت دے کر یہ چاہا کہ ان کے لیے ایک فوزِ عظیم کے حصول کی راہ کھولے۔ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے۔ اس کا ہر کام علم و حکمت پر مبنی ہوتا ہے اور اس کے اس کام میں بھی اس کی عظیم حکمت ہے۔ اس مضمون کی مزید وضاحت مطلوب ہو تو سورۂ محمد کی آیت ۴ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ آگے یہی آیت ایک اور پہلو سے آ رہی ہے۔ وہاں اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔

لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا (۵)

اَزدیادِ ایمان کا صلہ

یہ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ کا صلہ بیان ہوا ہے اور اسلوب بیان بدلیت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے نورِ باطن میں اضافہ کی راہیں جو کھولتا ہے تو اس لیے کہ اس طرح وہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایسے باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اور ان سے ان کے سارے گناہ دور فرما دے گا۔ یعنی یہ کوئی خسارے کا سودا نہیں

ہے بلکہ تمام تر نفع ہی نفع ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ دخولِ جنت کا ذکر پہلے ہے اور گناہوں کے جھاڑنے کا ذکر بعد میں۔ حالانکہ لوگ جنت میں گناہوں کے جھاڑے جانے کے بعد داخل ہوں گے، ہمارے نزدیک یہ تقدیم و تاخیر محض ظاہری ہے۔ بشارت کے پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے دخولِ جنت کا ذکر پہلے کر دیا گیا ہے، مقصود یہی بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو گناہوں سے پاک کر کے جنت میں داخل کرے گا۔

منافقین پر تعریض

وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک اصلی اور سب سے بڑی کامیابی یہی ہے تو مبارک ہیں وہ جنھوں نے یہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے تمام خطرات سے بے پروا ہو کر بازی کھیلی۔ یہ ٹکڑا تمہید ہے منافقین کے ذکر کی جو آگے آ رہا ہے اور جن کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ وہ قریش کے ڈر سے گھروں میں دبک کر بیٹھ رہے اور سمجھ رہے ہیں کہ ان کی سیاست بڑی کامیاب رہی اور بڑی ہوشیاری سے انھوں نے اپنے کو ایک بہت بڑے خطرے سے بچا لیا ہے حالانکہ انھوں نے اپنے کو خطرے سے بچایا نہیں بلکہ خطرے میں جھونک دیا ہے جس کا اندازہ ان کو بہت جلد ہو جائے گا۔

وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ۭ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۭ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (۶)

اللہ تعالیٰ کے امتحان کا دوسرا پہلو

یہ اس امتحان کے دوسرے پہلو کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ جس امتحان سے اہلِ ایمان کے لیے فوزِ عظیم کی راہ کھولتا ہے وہی امتحان لازماً منافقین و منافقات، اور مشرکین و مشرکات کے لیے سب سے بڑی تباہی یعنی دوزخ کی راہ کھولتا ہے اس لیے کہ اس سے ان کے کھوٹ ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں اور اللہ کی حجت ان پر تمام ہو جاتی ہے۔

اَلظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ سے ان منافقین کے ان گمانوں کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر آگے آیت ۱۲ میں بدیں الفاظ آیا ہے: بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۚ وَكُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا (بلکہ تم نے یہ گمان کیا کہ رسول اور مسلمانوں کو اس سفر سے اپنے گھر والوں کی طرف کبھی پلٹنا نصیب نہ ہو گا۔ یہ گمان تمھارے دلوں میں رچ بس گیا اور تم نے برے برے گمان کیے اور اس طرح تم ہلاک ہونے والے بنے)۔

منافقین اور مشرکین میں مماثلت

منافقین و منافقات کے ساتھ مشرکین و مشرکات کا جوڑ اس گہری قلبی و ذہنی مماثلت کی بنا پر ہے جو دونوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ جس طرح ایک مشرک اپنے رب کے ساتھ عہدِ بندگی کا مدعی ہوتے ہوئے دوسرے معبودوں کی پرستش کرتا ہے اسی طرح ایک منافق بھی اللہ و رسول کے ساتھ

عہدِ ایمان و اطاعت کا مدعی ہوتے ہوئے غیروں سے سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ الْأَمْرِ (محمد: ۲۶) (بعض معاملات میں ہم آپ ہی لوگوں کے ساتھ رہیں گے) کی سازشیں کرتا ہے۔ اس اشتراک کی بنا پر قرآن نے نفاق کو شرک قرار دیا ہے جس کی وضاحت ہم نے اپنی کتاب "حقیقتِ شرک" میں کی ہے۔ یہاں منافقین کا ذکر مشرکین کے ساتھ کر کے قرآن نے ان کا درجہ معین کر دیا کہ اس طرح کے مدعیانِ ایمان کا حشر بالآخر ان مشرکوں کے ساتھ ہی ہوگا جن کے یہ ہم مسلک و ہم مشرب ہیں۔

ایک بلیغ جملہ معترضہ

'عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ' کا فقرہ بطور جملہ معترضہ ہے۔ جب اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل سے متعلق ان کے بُرے گمانوں اور ان کی بُری تمناؤں کا ذکر آیا تو سلسلۂ کلام کے بیچ میں بغیر توقف کے فرما دیا کہ یہ لوگ مسلمانوں کے اوپر بری گردش کے منتظر ہیں حالانکہ بری گردش درحقیقت خود انہی کے اوپر ہے اس لیے کہ یہ لوگ جن لوگوں سے لو لگائے ہوئے ہیں ان کا انجام بہت جلد ان کے سامنے آجانے والا ہے اور اسی انجام سے یہ بھی دوچار ہوں گے۔ ان پر اللہ کی لعنت ہے، ان کے لیے اللہ نے جہنم تیار کر رکھی ہے اور وہ نہایت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔

مردوں کے پہلو بہ پہلو عورتوں کے ذکر کی حکمت

یہاں ایک بات اور بھی قابلِ توجہ ہے۔ اوپر اہلِ ایمان کے بیان میں بھی اور پھر منافقین و مشرکین کے ذکر میں بھی مردوں کے ساتھ عورتوں کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ آزمائش کے دَور کے حالات پر تبصرہ ہو رہا ہے۔ اس دَور میں اگر کسی گروہ کے اندر نفاق پرورش پاتا ہے تو اس کی پرورش میں بڑا دخل بیوی بچوں کا ہوتا ہے۔ اس کی طرف اشارہ منافقین کے اس قول سے بھی ہو رہا ہے جس کا حوالہ آگے آیت ۱۱ میں ہے کہ شَغَلَتْنَآ أَمْوَالُنَا وَأَهْلُوْنَا (ہم کو ہمارے مال اور اہل و عیال نے پھنسائے رکھا) اور حدیث میں بھی ارشاد ہے کہ الولد مبخلۃ مجبنۃ (آل و اولاد سب سے زیادہ بخل و بزدلی میں مبتلا کرنے والے ہیں) اسی طرح اگر کسی گروہ کے اندر ایمان مستحکم ہوتا ہے تو اس میں بھی بیوی بچوں کے عزم و صبر اور ان کے اعتماد علی اللہ کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ اہلِ ایمان اور اہلِ نفاق دونوں کے ذکر میں عورتوں کا کردار بھی سامنے آجائے تاکہ مومنات اور منافقات دونوں اپنی اپنی جگہ پر واقف ہو جائیں کہ ان کا رب نہ اپنی مومنہ بندیوں کی جاں نثاریوں سے بے خبر ہے اور نہ منافقات کی تن آسانیوں اور دنیا پرستیوں سے۔

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (۷)

منافقین سے اظہارِ بیزاری

یہی ٹکڑا صرف ایک لفظ 'عزیز' کے فرق کے ساتھ اوپر آیت ۴ میں بھی شامل ہے۔ وہاں یہ ایک خاص پہلو سے آیا ہے۔ یہاں یہ ان منافقین کے اظہار سے بیزاری و بے نیازی کے لیے وارد ہوا ہے کہ اگر یہ منافقین جہنم ہی کے ایندھن بننا چاہتے ہیں تو بن جائیں۔ خس کم جہاں پاک! اللہ کو ان بزدل لوگوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آسمانوں اور زمین کے سارے لشکر اس کے اپنے ہیں۔ وہ

ہر چیز پر غالب و مقتدر ہے اور ساتھ ہی وہ حکیم بھی ہے۔ اپنی حکمت کے تحت وہ ان لشکروں کو جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے۔ کسی کی بزدلی اور پست ہمتی اس کے ارادوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

۵۔ آگے آیات: ۸-۲۱ کا مضمون

آگے کی آیات میں پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ و مقام واضح فرمایا ہے پھر اس مرتبہ و مقام کے تقاضے سے اہل ایمان پر آپ کے جو حقوق قائم ہوتے اور آپ کے ہاتھ پر بیعت سے جو ذمہ داریاں ان پر عائد ہوئیں ان کی تصریح فرمائی ہے۔ پھر ان منافقین کے رویہ پر تفصیل سے تبصرہ کیا ہے جو اس موقع پر جھوٹے بہانے پیدا کر کے اپنے گھروں میں بیٹھ رہے، عمرہ کے لیے اس ڈر سے نہیں نکلے کہ مسلمانوں کو اس سفر سے پلٹنا نصیب نہیں ہوگا۔ پھر ان جاں باز مسلمانوں کا ذکر فرمایا ہے جنھوں نے نہایت بے سروسامانی کے حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی اور اپنے اخلاص و صدق نیت کے صلہ میں اللہ تعالیٰ کی ابدی خوشنودی کے حق دار اور دنیا میں اس کی تائید و نصرت کے سزاوار قرار پائے ـــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۸-۲۱

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿٨﴾ لِتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ۚ فَمَنْ نَكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ ۖ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهُ اللَّهَ فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١٠﴾ سَيَقُولُ لَكَ الْمُخَلَّفُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ شَغَلَتْنَا أَمْوَالُنَا وَأَهْلُونَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُولُونَ بِأَلْسِنَتِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۚ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ۚ بَلْ كَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿١١﴾ بَلْ ظَنَنْتُمْ أَنْ لَنْ يَنْقَلِبَ الرَّسُولُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَىٰ أَهْلِيهِمْ أَبَدًا وَزُيِّنَ

ع ۱ / ۹

ذٰلِكَ فِىْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۖۚ وَكُنْتُمْ قَوْمًا
بُوْرًا ﴿۱۲﴾ وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّاۤ اَعْتَدْنَا
لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۳﴾ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ
لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۴﴾
سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا
ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّنْ
تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ؕ
بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵﴾ قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ
سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ
فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا
تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶﴾ لَيْسَ عَلَى
الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ؕ
وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۷﴾ لَقَدْ رَضِىَ اللّٰهُ
عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِىْ
قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾
وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۹﴾
وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ

ع ۲ / ۱۰

وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۲۰﴾ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۱﴾

ترجمۂ آیات ۸ - ۲۱

بے شک ہم نے تم کو گواہی دینے والا، خوشخبری پہنچانے والا اور آگاہ کر دینے والا بنا کر بھیجا ہے تاکہ لوگو، تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ رسول کی مدد اور اس کی توقیر کرو اور اللہ کی تسبیح کرو صبح و شام ۔ ۸ - ۹

جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ تو جس نے عہد توڑا وہ اس نقض عہد کا وبال اپنے ہی سر لیتا ہے اور جو پوری کرے گا وہ بات جس کا اس نے اللہ سے عہد کیا تو اللہ اس کو ایک اجرِ عظیم دے گا ۔ ۱۰

جو لوگ اہل بدو میں سے پیچھے چھوڑ دیے گئے وہ اب تم سے عذر کریں گے کہ ہم کو ہمارے مال مویشی اور اہل و عیال کی ذمہ داریوں نے پھنسائے رکھا اس وجہ سے آپ ہمارے لیے مغفرت کی دعا کیجیے۔ یہ اپنی زبانوں سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے ان سے کہو، کون ہے جو تمہارے لیے اللہ سے کچھ اختیار رکھتا ہو اگر وہ تم کو کوئی نقصان یا نفع پہنچانا چاہے؟ بلکہ اللہ ان سب باتوں سے باخبر ہے جو تم کر رہے ہو۔ بلکہ تم نے یہ گمان کیا کہ رسول اور ان کے ساتھیوں کو اب کبھی اپنے گھر والوں کی طرف لوٹنا نصیب نہ ہوگا اور یہ بات تمہارے دلوں میں رچ بس گئی ہے۔ اور تم نے بُرے بُرے گمان کیے اور بالآخر ہلاک ہونے والے بنے۔ اور جو ایمان نہ لایا اللہ اور اس کے رسول پر تو ہم نے ان کافروں

کے لیے دوزخ تیار کر رکھی ہے۔ اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے۔ وہی بخشے گا جس کو چاہے گا اور سزا دے گا جس کو چاہے گا اور اللہ مغفرت فرمانے والا اور رحیم ہے۔ ۱۱-۱۴

جب تم غنیمتیں لینے کے لیے چلو گے تو یہ پیچھے چھوڑے ہوئے لوگ کہیں گے کہ ہمیں بھی اجازت دی جائے کہ ہم آپ لوگوں کے ساتھ چلیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی بات کو بدل دیں۔ کہہ دو، تم ہمارے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے۔ یہی بات تو اللہ نے تم کو پہلے بھی فرمائی تھی! تو وہ کہیں گے کہ بلکہ تم لوگ ہم پر حسد کرتے ہو۔ بلکہ یہی لوگ بہت کم سمجھتے ہیں۔ ۱۵

اہل بدو میں سے ان پیچھے چھوڑے ہوئے لوگوں سے کہہ دو کہ عنقریب تم لوگ ایک طاقتور حریف سے لڑنے کے لیے بلائے جاؤ گے، تم کو ان سے جنگ جاری رکھنی ہوگی یا وہ اسلام لائیں گے۔ تو اگر تم نے اس حکم کی اطاعت کی تو اللہ تم کو ایک اچھا اجر دے گا اور اگر تم نے منہ موڑا جیسا کہ تم نے پہلے منہ موڑا تو وہ تم کو ایک دردناک عذاب دے گا۔ ۱۶

نہ نابینا پر کوئی گناہ ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی گناہ ہے اور نہ مریض پر کوئی گناہ ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہے گا اللہ اس کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور جو روگردانی کرے گا تو اللہ اس کو ایک دردناک عذاب دے گا۔ ۱۷

اللہ راضی ہوا ایمان والوں سے جب کہ وہ تم سے بیعت کر رہے تھے درخت کے نیچے تو اللہ نے ان کے دلوں کا حال جان لیا تو اتاری ان پر طمانیت اور ان کو ایک عنقریب ظاہر ہونے والی فتح سے نوازا اور بہت سی غنیمتوں سے بھی جن کو وہ حاصل کریں گے

اور اللہ غالب و حکیم ہے۔ ۱۹

اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کیا ہے جن کو تم پاؤ گے۔ پس یہ اس نے تم کو فوری طور پر دے دی اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیے کہ یہ موجب طمانیت اور مسلمانوں کے لیے نشانی ہو اور تمھیں سیدھی راہ کی ہدایت بخشے۔ اور ایک دوسری فتح بھی ہے جس پر تم ابھی قادر نہیں ہوئے ہو لیکن اللہ نے اس کا احاطہ کر رکھا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۲۰-۲۱

۶- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ لِّتُؤْمِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ ۚ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا (۸-۹)

نبی صلعم کے مرتبہ و مقام کا بیان

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ ہم نے تم کو لوگوں کی طرف اپنے دین کی گواہی دینے والا اور مبشر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ 'گواہی دینے والا' یعنی اپنے دین کی گواہی دینے والا کہ ہم اپنے بندوں کو کس چیز کا حکم دیتے اور کس بات سے روکتے ہیں۔ ساتھ ہی اس لیے بھی بھیجا ہے کہ ان لوگوں کو جنت کی بشارت دو جو تمھاری گواہی قبول کر کے اپنی زندگیاں سنوار لیں اور ان لوگوں کو دوزخ کے عذاب سے ڈراؤ جو تمھاری گواہی کو رد کر دیں یا اس کو وہ اہمیت نہ دیں جس کی یہ سزاوار ہے۔ یہ بات اگرچہ ایک عام کلیہ کی حیثیت سے ارشاد ہوئی ہے لیکن کلام کے تدریجی ارتقا سے یہ حقیقت آپ سے آپ واضح ہو جائے گی کہ روئے سخن منافقین کی طرف ہے جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا زبان سے اقرار تو کر لیا تھا لیکن اس اقرار کے تضمنات سے وہ گریز اختیار کرنے کی راہیں ڈھونڈھتے رہتے تھے۔

شاہد کا مفہوم

'شَٰهِدًا' کے معنی ہیں 'گواہی دینے والا'، یعنی لوگوں کے سامنے اللہ کے دین کی گواہی دینے والا۔ عام طور پر لوگوں نے اس سے وہ گواہی مراد لی ہے جو آپ آخرت میں دیں گے لیکن ہمارے نزدیک یہ بات صحیح نہیں ہے۔ آخرت میں حضرات انبیاء علیہم السلام جو گواہی دیں گے وہ اسی بنا پر تو دیں گے کہ انھوں نے اس دنیا میں لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دی ہے۔ اس گواہی پر الاحزاب کی آیات ۴۵ کے تحت ہم بحث کر آئے ہیں۔ تفصیل مطلوب ہو تو اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ حضرات انبیاء

جو گواہی آخرت میں دیں گے المآئدۃ کی تفسیر میں اس پر مفصل بحث ہو چکی ہے۔

رسول اللہ صلعم کی بعثت کا مقصد اور امت پر آپ کا حق

لِتُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا۔ یہ مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ ہم نے اپنے رسول کو شاہد اور مبشر اور نذیر بنا کر اس مقصد سے بھیجا ہے کہ تم لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، رسول کی مدد اور اس کی توقیر کرو اور اللہ کی صبح و شام تسبیح کرو۔ ایمان سے مراد ظاہر ہے کہ سچا اور پکا ایمان ہے اللہ پر بھی اور اس کے رسول پر بھی۔ اس کے بعد صعودی ترتیب سے یعنی نیچے سے اوپر کو چڑھتے ہوئے اس ایمان کے وہ تقاضے بیان ہوئے جو بالکل بدیہی ہیں۔ رسول پر ایمان کا یہ تقاضا بیان فرمایا کہ اللہ کے دین کی اقامت کے لیے جو جدوجہد وہ کر رہے ہیں اس میں ان کے دست و بازو بنو اور ان کی توقیر و تعظیم اللہ کے رسول کی حیثیت سے کرو۔ پھر اللہ پر ایمان کا تقاضا یہ بیان فرمایا کہ صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔

مفسرین کی ایک غلط فہمی کا ازالہ

عام طور پر لوگوں نے تُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ کا تعلق بھی اللہ تعالیٰ ہی سے مانا ہے۔ ان کے خیال میں اگر ضمیر مفعول کا مرجع رسول مانا جائے تو اس سے بُعد پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔ یہاں ترتیب، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، صعودی ہے، اس وجہ سے بُعد نہیں پیدا ہوتا۔ اللہ و رسول پر ایمان کے مطالبہ کے بعد پہلے رسول کا حق اس لیے بیان فرمایا کہ رسول کا ذکر ترتیب میں مؤخر تھا اس وجہ سے اس کے ذکر سے متصل ہی اس کا حق بیان فرما دیا پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا حق بیان فرمایا۔ یہ ترتیب بیان قرآن میں جگہ جگہ اختیار فرمائی گئی ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اگر تُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ مانا جائے تو اس سے کلام میں بعض خرابیاں پیدا ہو جائیں گی جن سے کلام کو پاک ہونا چاہیے۔ مثلاً

ایک یہ کہ یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کے بیان کے سیاق و سباق میں ہے اس میں غایت بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کس مقصد سے شاہد اور مبشر و نذیر بنا کر بھیجا لیکن یہ تاویل اختیار کر لی جائے تو آیت آپ کے حقوق کے ذکر سے خالی رہ جاتی اور سیاق و سباق سے کٹ جاتی ہے۔

دوسری یہ کہ یہاں روئے سخن اصلاً منافقین کی طرف ہے جن کی اصلی کمزوری یہ تھی کہ وہ، ایمان کے مدعی ہونے کے باوجود، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت، جہاد میں آپ کی نصرت اور آپ کی صحیح تعظیم و توقیر (جس کی وضاحت اگلی سورہ میں آئے گی) سے عاری تھے۔ یہ صورت حال مقتضی تھی کہ ان کو رسول پر ایمان کے یہ بدیہی تقاضے بتائے جائیں۔ اگر تُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ مانا جائے تو آیت اپنے موقع و محل سے بے تعلق ہو جائے گی۔

تیسری یہ کہ تعزیر اور توقیر کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے لیے موزوں نہیں ہیں، یہ اپنے مواقع استعمال کے لحاظ سے رسول ہی کے لیے موزوں ہیں۔ 'تُوَقِّرُوْهُ' کا لفظ تو اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل ہی ناموزوں ہے۔ 'تُعَزِّرُوْهُ' بھی کہیں قرآن میں اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں استعمال ہوا ہے۔ جہاں بھی استعمال ہوا ہے رسولوں ہی کے لیے ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو المائدۃ: ۱۲ اور الاعراف: ۱۵۷۔ الفاظ کی موزونیت پر ہم نے سورۂ محمد کی آیت ۲۵ کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ قرآن میں بہت سی آیتیں ایسی ہیں جن میں مختلف افعال استعمال ہوئے ہیں اور صرف فعل سے یہ متعین ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی فعل کا فاعل یا مفعول کون ہے۔ اس چیز کا تعلق زبان کے ذوق سے ہے۔ اگر اس کا پورا لحاظ نہ رکھا جائے تو اس سے آیات کی تاویل میں بڑی غلط فہمیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (۱۰)

رسول کے ہاتھ پر بیعت کی ذمہ داریاں

یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید تائید ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ تمھارے ہاتھ پر سمع و طاعت کی بیعت کرتے ہیں انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ تم سے بیعت نہیں کرتے بلکہ درحقیقت وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ بیعت کے وقت ان کے ہاتھوں کے اوپر جو ہاتھ ہوتا ہے وہ تمھارا نہیں بلکہ اللہ کا ہوتا ہے۔ اگر وہ یہ بیعت کر کے اس کی ذمہ داریوں سے گریز اختیار کریں گے اور اپنے عمل سے اس عہد کو توڑیں گے جس کو اپنے قول سے انھوں نے باندھا ہے تو یاد رکھیں کہ اس کا وبال انہی کے اوپر آئے گا اس لیے کہ اس معاہدے میں اصل فریق اللہ تعالیٰ ہے اور اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے ساتھ بدعہدی کرنے والا خود ہی خسارے میں پڑتا ہے۔ اور یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جو شخص وہ ذمہ داری پوری کرے گا جس کے اٹھانے کا اس نے عہد کیا ہے وہ ہرگز خسارے میں نہیں رہے گا بلکہ اللہ تعالیٰ کے پاس وہ اس کا بہت بڑا اجر پائے گا۔

عام طور پر لوگوں نے اس آیت کو بیعتِ رضوان سے متعلق سمجھا ہے حالانکہ اس کو بیعتِ رضوان سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ بیعتِ رضوان کا ذکر آگے آیت ۱۸ میں آئے گا۔ یہ سمع و طاعت کی اس عام بیعت کا ذکر ہے جو ہر ایمان لانے والا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر کرتا تھا۔ یہاں اس کی عظمت و اہمیت اور اس کی ذمہ داریاں منافقین کو غیرت دلانے کے لیے بیان کی گئی ہیں کہ وہ رسول کے ہاتھ پر بیعت تو کر بیٹھے لیکن جب اس کے مطالبات پورے کرنے کا وقت آیا تو منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔ ان پر یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ رسول کے ہاتھ پر بیعت درحقیقت اللہ تعالیٰ سے معاہدہ ہے۔ اگر کوئی اس بیعت کی ذمہ داریوں سے گریز اختیار کرتا ہے تو وہ اللہ سے کیے ہوئے معاہدے کو توڑتا ہے۔

اور اس کا انجام دنیا اور آخرت دونوں میں رسوائی ہے۔

ایک نحوی شبہ کا ازالہ

اس آیت میں عَلَیْهُ اللّٰهَ کی ضمیر مجرور پر جو ضمہ ہے اس کی بنا پر بعض مستشرقین نے قرآن کی نحو پر اعتراض کیا ہے۔ ان بیچاروں کو پتہ نہیں ہے کہ نحو کی کتابیں قرآن کے اسلوب و اعراب کو پرکھنے کے لیے کسوٹی نہیں ہیں بلکہ قرآن نحو کی کتابوں کے جانچنے کے لیے کسوٹی ہے۔ قرآن قریش کی ٹکسالی زبان کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے اور ہر پہلو سے بالکل محفوظ بھی ہے۔ اس وجہ سے اگر اس کی کوئی چیز نحو کے توجیہات کے خلاف نظر آئے گی تو اس کی بنا پر قرآن کو متہم نہیں کریں گے بلکہ اس کو اہل نحو کے تتبع کے نقص پر محمول کریں گے۔ سیبویہ فن نحو کا امام ہے۔ میرے استاذ مولانا فراہیؒ بھی اس کو امام مانتے ہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے اس کے متعدد مسائل پر کلام عرب کی روشنی میں تنقید کرکے بتایا ہے کہ معروف اسلوب وہ ہے جو قرآن نے اختیار کیا ہے نہ کہ وہ جو سیبویہ نے قرار دیا ہے۔

فصیح عربی میں صرف آہنگ و صوت کے تقاضوں کے تحت بھی الفاظ، حروف اور ضمیروں پر ایسے ایسے تصرفات ہوئے ہیں کہ اگر کسی شخص کا علم صرف نحو کی کتابوں ہی تک محدود ہو تو وہ ان کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ یہ ضمیروں ہی کا مسئلہ لیجیے۔ قرآن میں متعدد مثالیں ایسی موجود ہیں کہ ضمیر لفظ کے اندر بالکل مدغم ہو کے رہ گئی ہے اور اس کی وجہ آہنگ و صوت کے تقاضے کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ مثلاً الاعراف کی آیت ۱۱۱ میں ہے: اَرْجِهْ وَاَخَاهُ (اس کو اور اس کے بھائی کو ابھی ٹالو) اسی طرح سورۂ نور کی آیت ۵۲ میں ہے: يَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ (اللہ سے ڈرے اور اس سے تقویٰ اختیار کرے)۔

آیت زیر بحث میں جس طرح ضمہ لوگوں کو عجیب معلوم ہوتا ہے بعینہٖ یہی صورت، سورۂ کہف آیت ۶۳ میں بھی ہے: وَمَآ اَنْسٰىنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ (اور مجھے اس سے نہیں غافل کیا مگر شیطان نے) یہاں مثالوں کا استقصاء مقصود نہیں ہے۔ اس مسئلہ کی مزید تحقیق کے خواہش مندوں کو آخری گروپ کی سورتوں میں بہت سی مثالیں ملیں گی کہ صرف آہنگ و صوت کے تقاضے سے حروف، الفاظ اور ضمیروں کی ہیئت میں ایسی تبدیلیاں ہو گئی ہیں جن کی اہل نحو کوئی توجیہ نہیں کر پاتے۔ یہاں بھی وہی صورت ہے۔

سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۚ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ۚ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۱۱)

منافقین کی پردہ دری

اب یہ وہ اصل بات ارشاد ہوئی ہے جس کے لیے اوپر کی تمہید استوار کی گئی ہے۔ فرمایا کہ جب تم اس سفر سے بخیریت گھر پہنچو گے تو بدویوں میں سے وہ لوگ جو پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے، جھوٹے عذرات لے کر تمھارے پاس آئیں گے کہ مال مویشی کی ذمہ داریوں اور بیوی بچوں کی دیکھ بھال کی مصروفیتوں

نے ہمیں آپ کی ہمرکابی کے شرف سے محروم رکھا۔ ہماری مجبوریوں پر نگاہ فرما کر اس کوتاہی کی معافی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے۔ ان لوگوں کی یہ معذرت درخور اعتنا نہیں۔ یہ زبانوں سے وہ بات کہیں گے جو ان کے دلوں میں نہیں ہے۔

'قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا' یعنی ان لوگوں سے پوچھو کہ اگر اپنے مفادات و مصالح کی اتنی اہمیت ہے کہ ان کی خاطر خدا اور رسول کے حقوق نظر انداز کرتے ہو تو بتاؤ کہ خدا اگر تمھیں کوئی ضرر یا نفع پہنچانا چاہے تو اس کے مقابل میں کون آڑے آئے گا!

'بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا' یعنی اس قسم کے لاطائل عذرات کی آڑ میں چھپنے کی کوشش نہ کرو۔ اللہ تمھارے تمام کارناموں سے، جو پس پردہ تم کرتے رہے ہو، اچھی طرح باخبر ہے۔

لفظ 'مخلف' کا مفہوم

یہاں ان منافقین کے لیے لفظ 'مُخَلَّفُوْنَ' استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں وہ لوگ جو پیچھے چھوڑ دیے گئے درانحالیکہ یہ لوگ خود پیچھے رہ جانے والے تھے۔ اس کی وجہ ہم سورۂ براءت میں بسلسلۂ منافقین غزوۂ تبوک واضح کر چکے ہیں کہ جب ان لوگوں نے پیچھے بیٹھ رہنے ہی کو اپنی دانش مندانہ سیاست سمجھا تو اللہ نے بھی ان کو پیچھے پھینک دیا، جیسا کہ فرمایا ہے 'فَلَمَّا زَاغُوْا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ' (الصف ۵) یعنی یہ لوگ اپنی بزدلی کے سبب سے آگے بڑھنے والے نہ بنے۔ اس وجہ سے خدا نے بھی ان کو پیچھے دھکیل دیا۔ یہ لوگ زیادہ تر اطرافِ مدینہ کے دیہاتوں سے تعلق رکھنے والے تھے اس وجہ سے ان کے لیے لفظ 'اعراب' استعمال ہوا ہے جو اہل بدو کے لیے معروف ہے۔

'قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا' میں 'يَمْلِكُ' متضمن ہے 'يَمْنَعُ' کے معنی پر اور 'مِنْ' کا صلہ اس تضمین پر دلیل ہے۔ ترجمہ میں ہم نے لفظ کے اس مضمر مفہوم کو کھول دیا ہے۔

بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۚ وَكُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا (۱۲)

منافقین کے دلوں کا اصلی بھید

اوپر والی آیت میں ان کے دلوں کے جس بھید کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہ اس کی وضاحت ہے کہ اصل چیز جس نے تم کو اس سفر سے روکا وہ تمھارا یہ گمان تھا کہ اب کے قریش ان مسلمانوں کو کچا ہی کھا جائیں گے اور کبھی ان کو اور ان کے پیغمبر کو اپنے اہل و عیال کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہو گا۔

'وَزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ' یعنی یہ گمان چونکہ تمھارا ایک دل پسند گمان تھا اس وجہ سے تم نے اپنے دلوں میں اس کو اچھی طرح آراستہ کیا اور سنتِ الٰہی کے مطابق یہ تمھارے دلوں میں اچھی طرح کھبا دیا گیا۔ پھر اس کے زیر اثر تم نے اسلام کے مستقبل سے متعلق نہایت برے برے گمان کیے اور یہ سمجھ بیٹھے کہ بس اب چند دنوں کے اندر اندر اس کا قصہ تمام ہوا جاتا ہے۔

'وَكُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا' یعنی تم تو اسلام اور مسلمانوں کی تباہی کے منتظر رہے لیکن اللہ تعالیٰ نے

تمھارے علی الرغم ان کو فتح مبین عطا فرمائی البتہ تم لوگ جو اس بات پر نازاں رہے کہ پیغمبر کا ساتھ نہ دے کر تم نے بڑی دانش مندانہ اور کامیاب سیاست اختیار کی، اپنے آپ کو ہلاکت کے کھڈ میں گرانے والے بنے۔

'بُوْرٌ' جمع ہے 'بَائِرٌ' کی۔ اس کے معنی ہلاک ہونے والے کے ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا (۱۳)

منافقین کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ

یہ انھی منافقین کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ سنایا ہے کہ جو لوگ ایمان کا دعویٰ رکھتے ہوئے اللہ و رسول کے حقوق ادا کرنے کے معاملے میں اپنے بزدل اور اسلام کے غلبہ کے بجائے اس کی تباہی کی آرزوئیں اپنے دلوں میں پرورش کر رہے ہیں وہ اللہ اور رسول پر ایمان رکھنے والے نہیں بلکہ کافر ہیں اور یہ کافر لوگ یاد رکھیں کہ ہم نے ان کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۱۴)

اور یہ لوگ یہ بات بھی یاد رکھیں کہ خدا کی پکڑ سے کوئی اور بچانے والا نہیں ہو گا۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی خدا ہی کی ہے۔ کوئی دوسرا اس کی اس بادشاہی میں شریک نہیں ہے۔ وہی جس کو چاہے گا بخشے گا، جس کو چاہے گا سزا دے گا۔

'وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا': البتہ یہ اطمینان ہر شخص کو رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ وہ لوگوں کو پکڑنا اور سزا دینا نہیں بلکہ ان پر مہربانی کرنا چاہتا ہے۔ اس وجہ سے لوگوں کو چاہیے کہ وہ غلط سہارے ڈھونڈنے کے بجائے اس کی رضا طلبی کی وہ راہ اختیار کریں جو اس نے اپنے پیغمبر کے ذریعہ سے لوگوں کے لیے کھولی ہے۔

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ؕ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۵)

یعنی اس موقع پر تو یہ بزدل لوگ بہانے بنا کر اپنے گھروں میں بیٹھ رہے لیکن آگے جب ایسے مواقع آئیں گے جن میں تم کو بغیر کسی جنگ کے بھرپور مال غنیمت حاصل ہونے کی توقع ہو گی تو یہ بھی بڑے شیر مرد بن کر تمھارے پاس آئیں گے کہ انھیں بھی ساتھ چلنے کی اجازت دی جائے۔ اس طرح وہ چاہیں گے کہ اللہ نے ان کے بارے میں جو فیصلہ فرمایا ہے اس کو بھی بدل دیں اور بغیر کوئی خطرہ مول لیے مالِ غنیمت بھی حاصل کر لیں۔ فرمایا کہ جب اس طرح کا موقع آئے تو ان سے کہہ دینا کہ تم لوگ ہمارے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے۔ اللہ نے اسی طرح کا حکم تمھیں اس سے پہلے بھی دیا لیکن اس وقت تم اپنے گھروں میں بیٹھ

رہے تو اب ہمارے ساتھ نکلنے کے لیے کیوں بے چین ہو!

'اِلٰی مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا' سے خیبر وغیرہ کی ان غنیمتوں کی طرف اشارہ ہے جو واقعۂ حدیبیہ کے بعد مسلمانوں کو حاصل ہوئیں۔ ان غنیمتوں کے لیے مسلمانوں کو کوئی خاص جنگ نہیں کرنی پڑی بلکہ دشمن نے مسلمانوں سے مرعوب ہو کر خود ہی میدان خالی کر دیا۔ خیبر کے یہودی بڑے مالدار تھے اس وجہ سے مسلمانوں کو کثیر تعداد میں مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ 'لِتَاْخُذُوْهَا' کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ گویا مسلمان گھروں سے نکلے ہی اس لیے کہ لغیر لڑے بھڑے مالِ غنیمت باندھ کر واپس آ جائیں۔

'يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ' یعنی یہ منافقین اس طرح کے مواقع پر ساتھ دینے کی پیشکش کر کے یہ چاہیں گے کہ اللہ کی اس بات کو بدل دیں جو ان کے بارے میں اس نے فرمائی ہے۔ یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے جو اوپر آیت ۶ میں بدیں الفاظ ارشاد ہوئی ہے: وَّيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ۚ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۚ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (اور تاکہ اللہ عذاب دے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرکین و مشرکات کو جو اللہ کے باب میں برے گمان رکھنے والے ہیں۔ برائی کی گردش انہی پر ہے! اور ان پر اللہ کا غضب ہوا اور اللہ نے ان پر لعنت کی اور ان کے لیے جہنم اس نے تیار کر رکھی ہے! اور وہ برا ٹھکانا ہے) مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ انھیں دین کے لیے کچھ کرنا تو نہ پڑے لیکن دنیا اور آخرت دونوں میں اس کے فوائد ان کو حاصل ہوں لیکن ان کی یہ خواہش پوری ہونے والی نہیں ہے۔ ان کے باب میں اللہ کی بات اس وقت تک نہیں بدل سکتی جب تک وہ اپنی حالت دین کے صحیح تقاضوں کے مطابق بدل نہ لیں۔

'قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ' یعنی اگر وہ تمھارے ساتھ نکلنے کی اجازت چاہیں گے تو ان کو اجازت نہ دیجیو بلکہ ان سے صاف صاف کہہ دیجیو کہ تم ہمارے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے۔ اسی طرح کا حکم تو اللہ نے تم کو پہلے دیا تھا لیکن تم نے اس کی تعمیل نہ کی بلکہ دبک کر گھروں میں بیٹھ رہے۔ ہمارے نزدیک یہ اشارہ عمرہ کی اس منادیٔ عام کی طرف ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کرائی لیکن ان منافقین نے اس کی تعمیل سے، جیسا کہ اوپر تفصیل سے واضح ہوا، گریز اختیار کیا۔ مطلب یہ ہے کہ جب اس سے پہلے تم رسول اور مسلمانوں کے ساتھ نکلنے سے گریز اختیار کر چکے ہو تو اب اس کے لیے اتنے کیوں بے قرار ہو؟ کیا اس لیے کہ اب کے تمھیں بغیر کسی خطرے کے لقمۂ تر کی توقع ہے۔

ایک غلط فہمی

بعض لوگوں نے 'كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ' سے اس قول کو مراد لیا ہے جس کا ذکر سورۂ توبہ کی آیت ۸۲ میں ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہو سکتی۔ سورۂ توبہ میں ان منافقین کا ذکر ہے جنھوں نے غزوۂ تبوک کے موقع پر بزدلی دکھائی تھی۔ یہ غزوہ، حدیبیہ کے واقعہ کے بہت بعد پیش آیا اور یہاں اشارہ کسی ایسے واقعہ کی طرف ہے جو حدیبیہ سے پہلے پیش آیا ہو۔ 'مِنْ قَبْلُ' کے الفاظ اس پر دلیل ہیں۔

'فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا... الآية' یعنی اگرچہ یہ لوگ اجازت نہ دینے پر بہت جزبز ہوں گے اور حسد کرنے کا طعنہ دیں گے لیکن ان کے اس طعنہ کی مطلق پروا نہ کی جائے اس لیے کہ یہ نہایت کم فہم لوگ ہیں۔ اپنی کم فہمی کے سبب سے یہ چاہتے ہیں کہ دین کے نام پر فوائد تو سب حاصل کریں، دنیا میں بھی، اور آخرت میں بھی، لیکن قربانی ان کو کوئی نہ دینی پڑے۔ ان پر اب یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ ان کی اس طرح کی طفلانہ آرزوئیں پوری ہونے والی نہیں ہیں۔

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۱۶)

منافقین کے لیے امتحان کی ایک کسوٹی

یہ ان منافقین کے سامنے امتحان کے لیے ایک کسوٹی رکھ دی گئی ہے کہ ان کو آگاہ کر دیا جائے کہ اگر تم فی الواقع اللہ و رسول کے وفادار ہو تو اس کا ثبوت تم اس طرح نہیں پہنچا سکتے کہ بغیر کوئی خطرہ مول لیے مالِ غنیمت حاصل کرنے کی توقع کرو بلکہ آگے وقت آ رہا ہے جب تمھیں ایک طاقتور گروہ سے جنگ کی دعوت دی جائے گی جس سے تمھیں اس عزم کے ساتھ جنگ کرنی پڑے گی کہ یا تو وہ اسلام قبول کرے یا تلوار۔ اگر تم نے یہ دعوت قبول کی اور اس دشمن سے نبرد آزما ہونے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو اللہ تعالیٰ تمھیں نہایت اچھا صلہ دے گا اور اگر تم اس وقت بھی بزدل ثابت ہوئے، جیسا کہ اس سے پہلے ثابت ہو چکے ہو تو یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمھیں ایک نہایت دردناک عذاب دے گا۔

بیت اللہ کی آزادی کے لیے قریش سے فیصلہ کن جنگ ناگزیر تھی

'قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ' سے مراد قریش ہیں۔ عرب میں انہی کی قوت و صولت ایسی تھی جس کی تعبیر کے لیے یہ الفاظ موزوں ہو سکتے ہیں۔ ان سے اگرچہ جنگ بندی کا معاہدہ ہو چکا تھا لیکن بیت اللہ کو ان کے تسلط سے آزاد کرانے کے لیے ایک فیصلہ کن جنگ ناگزیر تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد بعثت کی تکمیل اس کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی۔

مشرکین عرب کے لیے دو ہی راہیں تھیں اسلام یا تلوار

'تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ' قریش کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت چونکہ براہ راست ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے انہی کے اندر سے ایک رسول مبعوث کر کے، انہی کی زبان میں، ان پر حجت تمام کر دی تھی اس وجہ سے ان کے لیے دو ہی راہیں باقی رہ گئی تھیں یا تو اسلام قبول کریں یا تلوار۔ دوسری قوموں کے لوگ ذمّی اور معاہد بنائے جا سکتے تھے لیکن مشرکین بنی اسماعیل کے لیے اس قسم کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہاں تک کہ وہ غلام بھی نہیں بنائے جا سکتے تھے۔ بنی اسماعیل کے معاملے کی اس خاص نوعیت پر سورۂ براءت میں ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔

'وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ' یعنی اگر اس وقت بھی تم نے وہی بزدلی دکھائی جو اس سے پہلے عمرہ کے موقع پر دکھا چکے ہو تو یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمھیں بھی اسی طرح کا دردناک عذاب

دے گا جس طرح کا عذاب اس نے اسلام کے کھلے ہوئے معاندین کے لیے مقدّر کر رکھا ہے۔

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا (۱۷)

معذورین کا بیان

یہ ان معذورین کا بیان ہے جن کی جہاد سے غیر حاضری نفاق پر محمول نہیں کی جائے گی۔ فرمایا کہ اندھے، لنگڑے اور مریض پر کوئی الزام نہیں ہے اگر وہ جہاد میں حصہ نہ لے سکیں، بشرطیکہ وہ صدق دل سے اللہ و رسول کی اطاعت کرتے رہیں۔ اگر وہ اللہ و رسول کی اطاعت کرتے رہیں گے تو انھیں اس مجبورانہ کوتاہیِ خدمت کے سبب سے جنت سے محروم نہیں کیے جائیں گے بلکہ اللہ تعالیٰ ان کو بہشت میں داخل کرے گا اور اگر وہ اللہ و رسول سے اعراض کی روش اختیار کریں گے تو وہ بھی اسی دردناک عذاب سے دوچار ہوں گے جو دوسرے کفار و معاندین کے لیے مقدّر ہو چکا ہے۔

ان معذورین کا بیان سورۂ توبہ کی آیات ۹۱-۹۳ میں بھی ہوا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ وہاں اس کے بعض وہ پہلو واضح ہو گئے ہیں جو یہاں واضح نہیں کیے گئے ہیں۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۙ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (۱۸-۱۹)

جان بازوں کا صلہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کر چکنے کے بعد اس بیعت کے حقوق سے گریز اختیار کرنے والوں کے ذکر کے بعد یہ ان لوگوں کا بیان ہے جنھوں نے نہایت نازک حالات میں آپ کے ہاتھ پر حدیبیہ میں جہاد کی بیعت کی اور اس بیعت کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان بیعت کرنے والوں کے ذکر کا آغاز ہی لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ کے الفاظ سے فرمایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان جانبازوں کی اس بیعت ہی نے اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ایسی قدر کی جگہ پائی کہ ان کے لیے ابدی خوشنودی کا اعلان ہو گیا چنانچہ اسلام کی تاریخ میں یہ بیعت، بیعتِ رضوان کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بیعت جن حالات میں آپ نے کی اور مسلمانوں نے جس جوش و خروش کے ساتھ، عین دشمن کے مرکز میں، یہ بیعت کی، اس کی طرف ہم سورہ کی تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں، ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے سکینت کا نزول

'اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ'۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیعت کیکر کے ایک درخت کے نیچے ہوئی تھی۔ 'اَلشَّجَرَةِ' سے اشارہ کیکر کے اسی درخت کی طرف ہے۔ اس اشارے سے مقصود غربت و مسافرت کی اس حالت کو سامنے لانا ہے جس میں اسلام کی تاریخ کا یہ عظیم واقعہ پیش آیا۔

'فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ'۔ اس بیعت میں شرکت کرنے والے مسلمانوں

کی تعداد چودہ پندرہ سو سے زیادہ نہیں تھی۔ عمرہ کی پابندیوں کے سبب سے وہ نہتے بھی تھے۔ صرف حمیّتِ دینی کے تقاضے سے، اللہ تعالیٰ کی نصرت کے بھروسے پر، قریش کی زبردست طاقت سے ٹکر لینے کے لیے وہ کمربستہ ہو گئے۔ ایسے حالات میں ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ وانابت کی جو حالت طاری رہی ہوگی اس کا اندازہ اللہ تعالیٰ کے سوا کون کر سکتا ہے! اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ نے ان کے دلوں کا حال جان لیا اور ان کی دلداری کے لیے خاص اپنے پاس سے ان پر سکینت و طمانیت نازل فرمائی۔ یہ بات اس سنتِ الٰہی کے مطابق ہوئی جس کا ذکر اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں کہ جب اللہ کے بندے اس کی راہ میں جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو ظاہری حالات خواہ کتنے ہی نامساعد ہوں لیکن ربِ کریم ان کی حوصلہ افزائی فرماتا ہے اور یہی حوصلہ افزائی وہ اصل قوت ہے جس کو کوئی طاقتور سے طاقتور دشمن بھی شکست نہیں دے سکتا۔

حدیبیہ کے بعد کی فتوحات کی طرف اشارہ

'وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ۝ وَّمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا'۔ یہ اشارہ فتحِ خیبر اور ان غنائم کی طرف ہے جو حدیبیہ سے واپسی کے بعد معاً مسلمانوں کو حاصل ہوئیں اور جن سے مسلمانوں کے دلوں کے اندر یہ اعتماد راسخ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے فتح و نصرت کے جو وعدے فرمائے ہیں وہ پورے ہوں گے اور حدیبیہ کا معاہدہ ان کی شکست نہیں بلکہ فتح مبین ہے اور یہ فتح مبین ان شاء اللہ فتح مکہ کا دیباچہ ثابت ہوگی۔

'وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزًا حَكِيمًا'۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ان صفات کا حوالہ دیا ہے جو اس بات کی ضمانت ہیں کہ اس کے تمام وعدے ضرور پورے ہوں گے۔ ظاہری حالات خواہ کتنے ہی نامساعد ہوں لیکن اس کی قدرت و حکمت ہر چیز پر غالب ہے۔

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا (۲۰)

اوپر والی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمائی گئی تھی، یہ بات مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمائی گئی کہ اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا ہے جن کو تم مستقبل قریب میں حاصل کرو گے۔ ان وعدوں کی تصدیق کے لیے اللہ نے تمھیں یہ نقد نقد غنیمت بخش دی تاکہ تمھارے لیے یہ حوصلہ افزائی کا ذریعہ اور اسلام کے غلبہ کی ایک نشانی ہو۔

'فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ' سے مفسرین نے خیبر کی غنیمت مراد لی ہے۔ یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ خیبر کی فتح کا واقعہ حدیبیہ سے واپسی کے معاً بعد ہوا ہے۔

'وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ'۔ 'النَّاس' سے مراد قریش ہیں۔ معاہدۂ حدیبیہ میں دونوں فریق، مسلمان اور قریش یہ پابندی قبول کر چکے تھے کہ دس سال تک ایک دوسرے کے خلاف کوئی جنگی اقدام نہیں کریں گے۔ اس سے مسلمانوں کو یہ فائدہ پہنچا کہ انھیں خیبر کے یہودیوں کے خلاف اقدام کے لیے ایک

اچھا موقع مل گیا اور وہ یہ خیال کر کے کہ اب ان کو قریش کی پشت پناہی بھی حاصل ہو سکے گی بڑی جلدی حوصلہ ہار بیٹھے۔ اس طرح معاہدۂ حدیبیہ نے مسلمانوں کے لیے ایک قریبی فتح کی راہ کھول دی اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ معاہدہ مسلمانوں کی شکست نہیں بلکہ درحقیقت ایک فتح عظیم اور آئندہ کی فتوحات کا دیباچہ ہے۔

وَلِتَكُونَ آيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ: یہاں معطوف علیہ عربی کے معروف قاعدے کے مطابق محذوف ہے۔ یعنی اللہ نے خیبر کی یہ نقد نقد غنیمت مسلمانوں کو اس لیے عطا فرمائی کہ یہ ان کے لیے معاہدۂ حدیبیہ کے فتح مبین ہونے کی بھی ایک دلیل ہو اور مستقبل میں اسلام کے غلبہ و تمکّن کی بھی ایک نشانی کا کام دے۔

فتح مکہ کی بشارت

وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا: یہ ٹکڑا آیت ۲ کے تحت بھی گزر چکا ہے وہاں ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اب وہ وقت قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو تکمیلِ دین کی نعمت سے سرفراز فرمائے گا اور اپنے بندوں کے لیے ہدایت کی وہ صراطِ مستقیم پھر کھول دے گا جو اعدائے حق نے بند کر رکھی تھی۔ اس صراطِ مستقیم کے لیے اصلی نشانِ راہ کی حیثیت چونکہ خانہ کعبہ کو حاصل تھی اس وجہ سے اس میں کفار کے تسلط سے اس کے آزاد ہونے کی بشارت بھی مضمر ہے۔

وَّأُخْرَىٰ لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا (۲۱)

یہ فتح مکہ کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا کہ ایک دوسری اور بھی بہت بڑی کامیابی ہے جس کا اللہ نے تم سے وعدہ کر رکھا ہے۔ یہ کامیابی اگرچہ تم ابھی حاصل نہیں کر سکے ہو لیکن اس کے حصول میں بھی اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ اللہ نے اس کا احاطہ کر رکھا ہے اور جس کا اللہ نے احاطہ کر رکھا ہو وہ چیز قابو سے باہر نہیں نکل سکتی۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے وہ بہت جلد یہ کرشمہ بھی اپنی نصرت کا دکھا دے گا۔

۷۔ آگے آیات ۲۲-۲۶ کا مضمون

آگے مسلمانوں کو اس بات کی اطمینان دہانی فرمائی گئی ہے کہ اگر قریش اس موقع پر جنگ کرتے تو وہ خود ہی منہ کی کھاتے لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ ابھی اس جنگ کی نوبت نہ آئے تاکہ ان مسلمانوں کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے جو مکہ میں گرفتارِ بلا ہیں۔ اسی ضمن میں مسلمانوں کی وہ اخلاقی برتری نمایاں فرمائی ہے جو ان کو اس نازک موقع پر کفار کے مقابل میں حاصل ہوئی اور جس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اب قریش کی حمیّت جاہلیت کی عمر بہت تھوڑی رہ گئی ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے:

آیات ۲۲-۲۶

وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوَلَّوُا الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا

وَلَا نَصِيرًا ﴿۲۲﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلُ ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ﴿۲۳﴾ وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ﴿۲۴﴾ هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوفًا أَن يَبْلُغَ مَحِلَّهُ ۚ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُّؤْمِنَاتٌ لَّمْ تَعْلَمُوهُمْ أَن تَطَئُوهُمْ فَتُصِيبَكُم مِّنْهُم مَّعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ لِّيُدْخِلَ اللّٰهُ فِي رَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿۲۵﴾ إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنزَلَ اللّٰهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿۲۶﴾

ع ۳ / ۹ / ۱۱

ترجمہ آیات ۲۲-۲۶

اور اگر یہ لوگ جنھوں نے کفر کیا تم سے جنگ کرتے تو پیٹھ دکھاتے، پھر نہ کوئی کارساز پاتے نہ مددگار۔ یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی سنت ہے جو پہلے سے چلی آرہی ہے اور اللہ کی سنت میں تم کوئی تبدیلی نہیں پا سکو گے۔ ۲۲-۲۳

اور وہی ہے جس نے روک دیے ان کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ ان سے وادیٔ مکہ میں بعد اس کے کہ تم کو ان پر غلبہ دے دیا تھا اور اللہ دیکھ رہا تھا جو کچھ تم کر رہے تھے۔ ۲۴

(یہ) ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور قربانی کے جانوروں کو بھی روکے رکھا کہ وہ اپنی جگہ پر نہ پہنچنے پائیں اور اگر ایسے مومن مرد اور مومنہ عورتیں نہ ہوتے جن کو تم لاعلمی میں روند ڈالتے پس ان کے باعث تم پر لاعلمی میں الزام آتا تو ہم جنگ کی اجازت دے دیتے لیکن اللہ نے یہ اجازت اس لیے نہ دی) کہ جن کو وہ چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے۔ اور اگر وہ لوگ الگ ہو گئے ہوتے تو ہم ان لوگوں کو ان میں سے دردناک عذاب دیتے جنھوں نے کفر کیا۔ ۲۵

اس وقت کا خیال کرو جب کفر کرنے والوں نے اپنے دلوں میں حمیّت پیدا کی جاہلیت کی حمیّت۔ تو اللہ نے اپنی طمانیت نازل فرمائی اپنے رسول اور ایمان والوں پر اور ان کو پابند رکھا تقویٰ کی بات کا اور یہ اس کے حقدار اور سزاوار تھے اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ ۲۶

۸۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۲۲)

یہ مسلمانوں کو تسلی اور قریش کو تنبیہ ہے کہ خدا نے حدیبیہ کے موقع پر تمھیں جنگ کی جو اجازت نہیں دی تو اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ جنگ میں تمھاری شکست کا کوئی اندیشہ تھا۔ اگر جنگ ہوتی تو تم نہیں بلکہ تمھارے یہ حریف ہی پیٹھ دکھاتے اور اس طرح پٹتے کہ کوئی کارساز و مددگار ان کو سہارا دینے والا نہ ملتا۔ اس وجہ سے ان کے لیے مغرور ہونے اور اس معاہدے کو تمھاری کمزوری پر محمول کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے بلکہ انھیں خدا کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ اس نے ان کو حالات پر غور کرنے کی کچھ مہلت دے دی۔

مڈبھیڑ ہوتی تو قریش کی شکست یقینی تھی

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۲۳)

یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ

نے ٹھہرا رکھی ہے کہ جب ان کا پیمانہ بھر جاتا ہے تو ان پر ایسی مار پڑتی ہے کہ پھر کہیں بھی وہ پناہ نہیں پاتے اور یہ سنت ایسی حتمی اور اٹل ہے کہ کبھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ تمام رسولوں کی تاریخ اس پر شاہد ہے۔

وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا (۲۴)

حدیبیہ کے موقع پر جو کچھ ہوا تدبیر الٰہی سے ہوا

'بطن مکة' سے اشارہ حدیبیہ کی طرف ہے۔ یہ بالکل مکہ کے دامن میں ہے اس وجہ سے اس کو 'بطن مکہ' سے تعبیر فرمایا۔

یعنی اس موقع پر جنگ کی نوبت جو نہیں آئی تو یہ تدبیر الٰہی کا کرشمہ ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ان کے اوپر غلبہ دے دیا تھا، جنگ ہوتی تو ان کو منہ کی کھانی پڑتی، لیکن حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہی ہوا کہ ابھی یہ جنگ نہ ہو اس وجہ سے اس نے ان کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ ان سے روک دیے۔

'وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا' یعنی اللہ تعالیٰ سارے حالات کا خود جائزہ لے رہا تھا اس وجہ سے یہ جو کچھ ہوا اس کی حکمت کے مطابق ہوا اور اسی میں تمھاری بہتری ہے۔

مسلمانوں کے حوصلہ نے قریش کے اعصاب ڈھیلے کر دیے

'مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ' یعنی اخلاقی پہلو سے بھی تمھاری برتری ان کے مقابل میں نمایاں تھی اور عزم و حوصلہ کے اعتبار سے بھی تم ان پر حاوی رہے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ جب قریش کو مسلمانوں کے اس جوش و جذبہ کی اطلاع ہوئی جس کا اظہار انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہوئے کیا تو ان کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ چنانچہ انھوں نے فوراً وفد بھیج کر صلح کی بات چیت شروع کر دی۔ اس وفد نے اپنی آن رکھنے کی کوشش تو ضرور کی لیکن یہ بات بالکل واضح تھی کہ یہ لوگ مسلمانوں سے لڑنے کا دم خم نہیں رکھتے تھے چنانچہ انھوں نے ازخود معاہدے میں یہ بات تسلیم کر لی کہ اگلے سال جب مسلمان عمرہ کے لیے آئیں گے تو وہ تین دن کے لیے مکہ خالی کر دیں گے تاکہ کسی تصادم کا کوئی اندیشہ نہ رہے۔

هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوفًا أَن يَبْلُغَ مَحِلَّهُ ۚ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُّؤْمِنَاتٌ لَّمْ تَعْلَمُوهُمْ أَن تَطَئُوهُمْ فَتُصِيبَكُم مِّنْهُم مَّعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ لِّيُدْخِلَ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (۲۵)

جنگ کی نوبت نہ آنے دینے کی حکمت

یہ حکمت بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے جنگ نہیں ہونے دی۔ فرمایا کہ اگرچہ قریش کی زیادتیاں بالکل کھلی ہوئی تھیں، انھوں نے دعوتِ حق کا انکار کیا، اہل ایمان کو مسجد حرام کی حاضری سے روکا اور قربانی کے جانوروں کو ان کے قربان ہونے کی جگہ پہنچنے کی اجازت

نہ دی لیکن ان تمام گستاخیوں اور تعدّیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ ابھی مسلمان ان کے خلاف تلوار نہ اٹھائیں۔ اس کی سب سے بڑی مصلحت یہ تھی کہ مکہ میں ایسے بہت سے اہلِ ایمان تھے، مرد بھی اور عورتیں بھی، جن سے مسلمان واقف نہیں تھے، اندیشہ تھا کہ اگر وہ حملہ کرتے تو کفار کے ساتھ یہ مظلوم اہلِ ایمان بھی نادانستہ ان کی زد میں آجاتے جس سے ان کے اوپر اپنے بھائیوں کے خون کا الزام آتا۔ دوسری مصلحت یہ تھی کہ ان اہلِ مکہ میں ایسے لوگ بھی بہت سے تھے جو اگرچہ ابھی ایمان نہیں لائے تھے لیکن وہ ایمان کے قریب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ ان کو بھی اپنے دامنِ رحمت میں لے لے۔

'لَوْ تَزَیَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا'۔ فرمایا کہ اگر یہ اہلِ ایمان ان سے الگ ہو چکے ہوتے تو اللہ تعالیٰ کفارِ قریش کو اپنے دردناک عذاب کا مزا چکھا دیتا۔

اس دردناک عذاب سے مسلمانوں کا حملہ بھی مراد ہو سکتا ہے اور اس طرح کا کوئی عذاب بھی جس طرح کا عذاب پچھلی قوموں پر آیا۔ ان کے حالات میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ جب انھوں نے رسول کی تکذیب کر دی تو اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو ان کے اندر سے الگ کر لیا اور باقی پوری قوم کو تباہ کر دیا۔

ایک شبہ کا ازالہ

اس آیت سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ اگر مسلمانوں کو کسی ایسی قوم سے جنگ کرنی پڑ جائے جس کے اندر مسلمان بھی ہوں تو انھیں حتیٰ الامکان یہ کوشش کرنی ہوگی کہ مسلمانوں کو کوئی گزند نہ پہنچنے پائے۔ البتہ اگر دشمن اس سے کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے، مثلاً وہ مسلمانوں کو مسلمانوں سے لڑنے کے لیے محاذ پر لا کھڑا کرے یا اپنے کو بچانے کے لیے ان کو سپر کے طور پر استعمال کرے یا مسلمان خود ہی وطنی عصبیت یا کسی دنیوی مصلحت سے مسلمانوں سے لڑنے کے لیے اکھٹرے ہوں تو ان حالات میں اسلام اور ملّت کے مجموعی مفاد کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا اگرچہ اس سے مسلمانوں کے کسی گروہ کو نقصان بھی پہنچ جائے۔

قریش کی ایک سنگین گستاخی کی طرف اشارہ

آیت میں 'ھدی' کے ساتھ 'مَعْکُوْفًا' صورتِ حال کی نزاکت کے اظہار کے لیے ہے کہ باوجودیکہ قریش کی یہ حرکت نہایت گستاخانہ تھی کہ بادشاہِ کائنات کے حضور میں پیش کرنے کے لیے جو ہدیے لائے گئے ان کو انھوں نے روک دیا اور وہ قربان گاہ تک نہ پہنچنے پائے تاہم اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ ابھی ان کو اس گستاخی کی سزا نہ دی جائے تاکہ جو مسلمان ان کے اندر محصور ہیں ان کو کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔

آیت میں 'لَوْ' کا جواب محذوف ہے اور یہ حذف متکلم کے شدّتِ غضب پر دلیل ہے۔ اس اسلوب کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ آگے کے ٹکڑے 'لَوْ تَزَیَّلُوْا ... الآیۃ'

نے اس حذف کو کھول دیا ہے۔

تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ میں اَنْ تَطَـُٔوْا ضمیر هُمْ سے بدل پڑا ہوا ہے یعنی اندیشہ تھا کہ تم ان کو پامال کر دینے سے بے خبر رہ جاتے اور اس طرح بے خبرانہ تمھارے اپنے ہی بھائیوں کا خون خود تمھارے ہی ہاتھوں بہہ جاتا۔

اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (۲۶)

نہایت نازک حالات میں مسلمانوں نے اخلاقی برتری کا ثبوت دیا

یہ مسلمانوں کی اخلاقی برتری واضح فرمائی ہے کہ ہرچند قریش نے قدم قدم پر حمیت جاہلیت کا مظاہرہ کیا جس سے مسلمان مشتعل ہو سکتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو بھی اور مسلمانوں کو بھی یہ توفیق بخشی کہ وہ ان نازک حالات سے نہایت صبر و سکون اور حلم و تدبر کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے، حریف کی اوچھی حرکتوں سے متاثر ہو کر کوئی ایسا قدم انھوں نے نہیں اٹھایا جو اللہ تعالیٰ کی مرضی اور دین کے مصالح کے خلاف ہو۔

'سَكِيْنَة' سے مراد یہاں صبر، حلم، رزانت اور حکمت و تدبر ہے۔ اجتماعی زندگی میں ایسے مراحل بہت پیش آتے ہیں جب کسی جماعت کے علم و تدبر کا نہایت سخت امتحان ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر اگر جماعت حریف کے رویہ سے مشتعل ہو کر کوئی عاجلانہ قدم اٹھا دے تو اس سے اصل مقصد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی سے یہ بات حاصل ہوتی ہے کہ ایسے امتحانات سے کوئی جماعت اور اس کے لیڈر حسن و خوبی سے عہدہ برآ ہوتے ہیں اور یہ توفیق ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو ہر حال میں اپنے رب سے وابستہ رہتے ہیں۔

قریش کی طرف سے حمیت جاہلیت کا مظاہرہ

'حمیتِ جاہلیت' سے اشارہ قریش کے لیڈروں کی ان حرکتوں کی طرف ہے جو انھوں نے حق و عدل کے بالکل خلاف محض اپنی ناک اونچی رکھنے کے لیے کیں۔ مثلاً

ان پر یہ حقیقت واضح تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف عمرہ کے لیے تشریف لائے ہیں، جنگ کا نہ آپ کے دل میں کوئی خیال ہے، نہ اس کا آپ کے پاس کوئی سامان ہی ہے لیکن اس کے باوجود وہ کسی طرح آپ کو اللہ کے گھر میں داخل ہونے اور اس کے حضور میں اپنے لائے ہوئے ہدیے پیش کرنے کی اجازت دینے پر راضی نہ ہوئے۔

حضورؐ نے اپنے جو سفیر ان کے پاس اپنی آمد کی غرض سے آگاہ کرنے کے لیے بھیجے ان کی سفارتی حیثیت کا نہ صرف یہ کہ انھوں نے کوئی احترام نہیں کیا بلکہ ان میں سے ایک سفیر کے وہ قتل کے درپے ہو گئے اور دوسرے کو انھوں نے اس طرح لیت و لعل میں رکھا کہ مسلمانوں کے اندر

یہ افواہ پھیل گئی کہ اس کو بھی انھوں نے قتل کر دیا۔

معاہدۂ حدیبیہ کی شرائط طے کرنے میں انھوں نے بالکل بے ضرورت اُلجھنیں پیدا کیں اور ایسی شرطیں اس میں داخل کرنے پر اصرار کیا جن کا کوئی سیاسی فائدہ ان کو حاصل نہیں ہوا بس وقتی طور پر ان کو یہ تسلّی ہو گئی کہ ان کی بات اونچی رہی۔

مسلمانوں کا علم اور تقویٰ

قریش کے اس رویہ کا قدرتی ردِ عمل مسلمانوں پر یہی ہو سکتا تھا کہ وہ اشتعال میں آ کر اینٹ کا جواب پتھر سے دیں لیکن اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ سکینت کے فیض سے وہ اللہ اور رسول کے فیصلہ پر راضی رہے۔

'وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى' یعنی قریش کی ان تمام اشتعال انگیز حرکتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو 'کلمۂ تقویٰ' کا پابند رکھا۔ 'کلمۂ تقویٰ' سے مراد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جاں نثار صحابہؓ کا یہ اعتراف و اعلان ہے کہ 'رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِمُحَمَّدٍ رَّسُوْلًا وَّبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا'۔ یہی کلمہ شیطان اور اس کے ایجنٹوں کی وسوسہ اندازیوں کے مقابل میں ہمیشہ صداقت شعار اور باوفا مسلمانوں کی سپر رہا ہے۔ مسلمانوں کے سامنے جب کبھی ایسے حالات پیش آئے کہ انھیں رسول کی کوئی بات بظاہر خلافِ مصلحت محسوس ہوتی ہے تو انھوں نے اس کو ایک وسوسہ خیال کیا اور اس وسوسہ کو اسی اعتراف سے رفع کیا۔ یہی عظیم کلمہ اس نازک موقع پر بھی مسلمانوں کی ڈھال بنا اور وہ رسول کے فیصلہ پر راضی رہے اگرچہ ان کے جذبات اور ان کی امنگوں کا مطالبہ کچھ اور تھا۔

'وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا' یعنی اس کلمۂ تقویٰ پر استقامت ہر مدعی کو حاصل نہیں ہوتی بلکہ انہی کو حاصل ہوتی ہے جو اس کے حق دار اور اہل ہوتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ چونکہ اس کے حق دار اور اہل تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ان نازک حالات کے اندر بھی استوار رکھا۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ایمان کو ضائع نہیں ہونے دیتا جو اپنے ایمان کی قدر کرتے اور ہر قسم کے حالات کے اندر اس پر استوار رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔

'وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا' یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حال سے بے خبر نہیں رہتا۔ وہ ان آزمائشوں سے بھی باخبر رہتا ہے جن میں وہ ڈالے جاتے ہیں اور ان حالات و احساسات سے بھی پوری طرح آگاہ رہتا ہے جن سے وہ گزرتے ہیں۔ اگر بندے اپنا وہ فرض ادا کرتے ہیں جو ان سے مطلوب ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو تنہا نہیں چھوڑتا بلکہ ہر گام پر ان کا مددگار و کارساز بنتا ہے۔

۹- آگے آیات ۲۷ - ۲۹ کا مضمون

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں پہلے یہ واضح فرمایا ہے کہ رسول نے جو رؤیا دیکھی وہ

بالکل سچی تھی۔ اس کی تعبیر کے ظہور میں جو تاخیر ہوئی وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی ہے۔ اس کے بعد تورات اور انجیل میں اسلام اور مسلمانوں کے غلبہ کی جو پیشین گوئیاں ہیں ان کا حوالہ ہے تاکہ مسلمانوں کو تسلی بھی حاصل ہو اور وہ اپنے آپ کو ان صفات سے آراستہ بھی کریں جو پچھلے صحیفوں میں ان کی بیان ہوئی ہیں — اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۷-۲۹

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۲۷﴾ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۲۸﴾ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۫ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۛۖۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۛۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾

معانقہ ۱۵ — ع ۳ — ۱۲

ترجمۂ آیات ۲۷-۲۹

اللہ نے اپنے رسول کو مبنی بر حقیقت رؤیا دکھائی۔ بے شک اللہ نے چاہا تو تم مسجد حرام میں ضرور داخل ہو گے، امن کے ساتھ، اپنے سر منڈائے اور کترائے ہوئے، تمھیں کوئی اندیشہ نہیں ہو گا، بس اس نے جانی وہ بات جو تم نے نہیں جانی تو اس سے

پہلے اس نے تمھیں ایک فتح قریب سے نوازا۔ وہی ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ تاکہ اس کو غالب کرے سارے دینوں پر اور اللہ کی گواہی کافی ہے۔ ۲۷-۲۸

محمد، اللہ کے رسول اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت آپس میں رحم دل ہیں۔ تم ان کو اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں رکوع و سجود میں سرگرم پاؤ گے۔ ان کا امتیاز ان کے چہروں پر سجدوں کے نشان سے ہے۔ ان کی یہ تمثیل تورات میں ہے اور انجیل میں ان کی تمثیل یوں ہے کہ جیسے کھیتی ہو جس نے نکالی اپنی سوئی، پھر اس کو سہارا دیا، پھر وہ سخت ہوئی پھر وہ اپنے تنہ پر کھڑی ہو گئی کسانوں کے دلوں کو موہتی ہوئی تاکہ کافروں کے دل ان سے جلائے۔ اللہ نے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے مغفرت اور ایک اجرِ عظیم کا وعدہ کیا ہے۔ ۲۹

۱۰۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ۭ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا (۲۷)

نبی صلعم کی رؤیا مبنی بر حقیقت تھی

پیچھے یہ اشارہ گزر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمرہ کا ارادہ اپنی ایک رؤیا کی بنا پر فرمایا تھا اس وجہ سے لوگوں کو توقع تھی کہ ان کا یہ سفر بامراد رہے گا لیکن جب نتیجہ توقع کے خلاف نکلا تو بہتوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ نبی کی رؤیا تو غلط نہیں ہوتی تو آخر ہم کو اس سفر سے بے نیلِ مرام کیوں لوٹنا پڑا؟ اسی سوال کے جواب کے لیے صلح حدیبیہ کی مذکورہ بالا مصلحتیں واضح فرمائی گئیں۔ آخر میں بہ خاص اس رؤیا کا حوالہ دے کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو جو رؤیا دکھائی وہ بالکل

سچی اور مبنی بر حق رؤیا ہے۔ اس کے مبنی بر حق ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ نے چاہا تو تم مسجد حرام میں نہایت امن کے ساتھ، سر گھٹائے اور کترائے ہوئے داخل ہو گے اور تمھیں کسی کی طرف سے کسی مزاحمت کا کوئی اندیشہ نہیں ہو گا۔ مطلب یہ ہے کہ اب تمھارے لیے عمرہ کی راہ خود معاہدے کی رُو سے صاف ہو گئی۔ بس صرف اتنا فرق پڑا کہ اس سال نہیں بلکہ اگلے سال یہ سعادت حاصل ہو گی اور یہ التوا بھی رؤیا کے خلاف نہیں ہوا۔ اس لیے کہ رؤیا میں یہ وعدہ نہیں تھا کہ یہ عمرہ اسی سال لازماً ہو گا۔ چنانچہ بعض لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ سوال پیش کیا تو آپ نے فرمایا کہ رؤیا میں یہ وعدہ تو نہیں کیا گیا تھا کہ ہم اسی سال عمرہ کریں گے۔ گویا رؤیا میں جو وعدہ فرمایا گیا وہ غلط نہیں ہوا بلکہ یہ ہوا کہ اس سال عمرہ کی راہ اچھی طرح ہموار کر دی گئی تاکہ آئندہ سال مسلمان آئیں تو انھیں کوئی خطرہ نہ پیش آئے۔ 'بِالْحَقِّ' کا تعلق 'رؤیا' سے ہے یعنی یہ رؤیا کوئی خواب پریشان کے قسم کی چیز نہیں بلکہ مبنی بر حقیقت رؤیا تھی۔

'مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ' سر منڈانا یا کترانا حج و عمرہ کے آداب میں سے ہے۔ اس کی حکمت پر اس کے محل میں ہم گفتگو کر چکے ہیں۔ ان دونوں میں سے افضلیت تو سر منڈانے کو حاصل ہے لیکن باعتبار حالات قصر کی بھی اجازت ہے۔ اس وجہ سے دونوں ہی چیزوں کا ذکر فرمایا۔ مقصود یہ ہے کہ یہ جماعت دونوں ہی طرح کے زائرین پر مشتمل ہو گی جو عبدیت و تذلل کے اس نمایاں نشان کے ساتھ اللہ نے چاہا تو مسجد حرام میں داخل ہوں گے اور بے خوف و خطر داخل ہوں گے۔

التوائے عمرہ کی مصلحتوں کی طرف اشارہ

'فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا' یہ اشارہ التوائے عمرہ کی مصلحتوں کی طرف ہے جن کا ذکر آیت ۲۵ میں ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مصلحتیں تمھارے علم میں نہیں تھیں لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں تھیں اس وجہ سے اس نے یہ تو نہیں پسند فرمایا کہ تم اسی سال قریش پر فتحیاب ہو کر عمرہ کرو لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ اس سال بھی تم عمرہ کے لیے نکلو تاکہ اللہ تعالیٰ تمھیں ایک 'فتح قریب' سے سرفراز کرے جو آگے حاصل ہونے والی فتوحات کی راہ بھی کھول دے اور تمھارا عمرہ بھی امن و اطمینان کی حالت میں ہو۔

'فتح قریب' سے مراد معاہدۂ حدیبیہ ہے

'فتح قریب' سے عام طور پر لوگوں نے 'فتح خیبر' کو مراد لیا ہے لیکن میرے نزدیک اس سے معاہدۂ حدیبیہ ہی مراد ہے جس کو اسی سورہ کی تمہید میں 'فتح مبین' سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس 'فتح مبین' کی برکات پر، ہم قرآن کی روشنی میں، پیچھے جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ یہی 'فتح قریب'، فتح مکہ کا دیباچہ ثابت ہوئی۔ فتح مکہ ابھی کچھ دور تھی لیکن معاہدۂ حدیبیہ نے، جیسا کہ پیچھے تفصیل گزر چکی ہے، اس کی راہ ہموار کر دی تھی اس وجہ سے اس کو 'فتح قریب' سے تعبیر فرمایا۔ گویا اس کے بعد اب وہی اصلی فتح ظاہر ہونے والی ہے جو ابھی اگرچہ ظاہر نہیں ہوئی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے

اس کو، جیسا کہ آیت ۲۱ میں اشارہ فرمایا، اپنے احاطہ میں لے رکھا ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا (۲۸)

اسلام کے غلبہ کی بشارت

یہ آیت معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ سورۂ توبہ میں بھی گزر چکی ہے اور آگے سورۂ صف میں بھی آئے گی۔ سورۂ توبہ کی تفسیر میں ہم اس کے موقع و محل اور اس کے مدعا کی وضاحت کر چکے ہیں۔ یہ دوسرے الفاظ میں فتح مکہ کی بشارت ہے اس لیے کہ اسی کی فتح پر پورے ملک کے اندر دینِ حق کے غلبہ کا انحصار تھا چنانچہ اس کے فتح ہو جانے کے بعد تمام ادیان، جو عرب میں موجود تھے، اسلام کے آگے سرنگوں ہو گئے اور تھوڑی ہی مدت کے اندر وہ وقت آ گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرما دیا کہ اس ملک میں دو دین مجتمع نہیں ہو سکتے۔ فرمایا کہ اسی خدا نے، جس نے اپنی وہ شانیں دکھائی ہیں، جو اوپر بیان ہوئیں، اپنے رسول کو اپنی ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے کہ اس کو تمام ادیان پر غالب کرے۔ مطلب یہ ہے کہ اب یہ تقدیر کا اٹل فیصلہ ہے، نہ اس کو مشرکین بدل سکتے اور نہ یہود و نصاریٰ۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ سب کے علی الرغم نافذ ہو کے رہے گا۔ سورۂ توبہ میں یہی مضمون ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَیَاْبَی اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (۳۲ - ۳۳)	(یہود و نصاریٰ) چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونھوں کی پھونک سے بجھا دیں لیکن اللہ کا اٹل فیصلہ ہے کہ وہ ان کافروں کے علی الرغم اپنے نور کو کامل کر کے رہے گا۔ وہی ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے مشرکوں کے علی الرغم!

اس آیت کے سیاق و سباق پر نظر ڈالیے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ اوپر والی آیت میں اہلِ کتاب کو چیلنج ہے اور نیچے والی آیت میں مشرکین عرب کو۔ سرزمینِ عرب میں انہی گروہوں سے اسلام کا مقابلہ تھا۔ بعد میں یہ میدانِ مقابلہ بہت وسیع ہو گیا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ جب تک مسلمان اسلام کے حامل رہے ہر جگہ اللہ نے ان کے دین کو غالب کیا۔

وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا یعنی اس بشارت کو مخالفین خواہ کتنا ہی بعید از قیاس سمجھیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے اور اس کی صداقت کے لیے اللہ کی گواہی کافی ہے۔ یہ مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ تم مخالفین کی مخالفت اور حالات کی نامساعدت سے ذرا بھی ہراساں نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہو کے

رہے گا۔ سورۂ توبہ کی مذکورہ بالا آیت میں جو بات 'وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ' اور 'وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ' کے الفاظ میں فرمائی گئی ہے وہی بات یہاں دوسرے الفاظ میں ارشاد ہوئی ہے۔

مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ۖ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا ۖ سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ۚ ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۗ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا (۲۹)

ان تمثیلات کا حوالہ جو اسلام کے تدریجی غلبہ سے متعلق سابق صحیفوں میں ہیں

یہ آخر میں ان تمثیلوں کا حوالہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کی صفات اور اسلام کے تدریجی غلبہ سے متعلق تورات و انجیل میں وارد ہیں۔

اس حوالہ سے ایک مقصد تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو سابق صحیفوں کے آئینہ میں ان کی تصویر دکھا دی جائے تاکہ ان کو بشارت بھی حاصل ہو اور وہ اپنی ان صفات سے اچھی طرح آشنا بھی ہو جائیں جن سے اللہ تعالیٰ نے ان کو متصف دیکھنا چاہا ہے اور جو خلق میں ان کو متعارف کرانے والی ہیں۔

دوسرا یہ کہ اہل کتاب کو متنبہ کیا جائے کہ وہ جان کر انجان بننے اور حق کو چھپانے کی کوشش نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو پہلے سے اس لیے آگاہ کیا تھا کہ جب وقت آئے گا وہ شہادت دینے والے بنیں گے۔ لیکن یہ ان کی بدبختی ہے کہ وہ شہادت دینے کے بجائے مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

تیسرا یہ کہ مسلمانوں پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اس سرزمین میں ان کو غلبہ تو ضرور عطا فرمائے گا لیکن یہ غلبہ بالتدریج ظہور میں آئے گا۔ نہ انھیں جلد بازی کرنی چاہیے نہ حالات سے مایوس ہونا چاہیے۔ جو بیج انھوں نے ڈالا ہے صبر و استقامت کے ساتھ اس کی آبیاری اور دیکھ بھال میں لگے رہیں۔ وقت آئے گا کہ اللہ تعالیٰ اس کو ایسا تناور درخت بنائے گا کہ ایک دنیا اس کے سایہ میں پناہ لے گی۔

تورات میں وارد ایک تمثیل کی طرف اشارہ

'مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ' کا ترجمہ عام طور پر مترجموں نے مبتدا اور خبر کا کیا ہے لیکن میرے نزدیک 'رَّسُولُ اللَّهِ' یہاں صفت اور عطف بیان کے حکم میں ہے۔ خبر اس کی آگے 'أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ ... الآیۃ' ہے۔ یہ تورات میں وارد ایک تمثیل کی طرف اشارہ ہے جس میں پورے زمرۂ مومنین کی تصویر اس طرح پیش کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں گل سر سبد کی حیثیت حاصل ہے۔ اگر 'رَّسُولُ اللَّهِ' پر وقف اور 'وَالَّذِينَ مَعَهُ' سے استیناف مان لیا جائے تو آیت کی یہ بلاغت ختم ہو جائے گی۔ اس پورے گروپ کا اصل جمال اسی صورت میں نمایاں ہو گا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں سرتاج کی حیثیت حاصل رہے جیسی کہ فی الواقع ہے۔

چٹان کی طرح سخت ریشم کی طرح نرم

'وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ' یہ آپ کی اور آپ کے صحابہؓ کی ایک

امتیازی خصوصیت بیان ہوئی ہے کہ وہ کفار کے لیے ایک چٹان کی طرح مضبوط و سخت اور باہمدگر موم کی طرح نرم ہیں۔ یعنی ان کی تمام حمیّت و عصبیّت ایمان و اسلام پر قائم ہے۔ جو ایمان و اسلام میں ان کے شریک نہیں ہیں وہ اگر ان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہیں تو ان کے اندر انگلی دھنسانے کی کوئی گنجائش نہیں پائیں گے۔ برعکس اس کے اپنے شریک ایمان بھائیوں کے لیے وہ سراپا رحمت و شفقت ہیں۔ یہی مضمون بعینہٖ اسی سیاق و سباق کے ساتھ سورۂ مائدہ کی آیت ۵۴ میں اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ چونکہ یہ دونوں آیتیں ایک ہی مضمون کی ہیں اس وجہ سے وہاں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ضروری حصہ یہاں بھی نقل کیے دیتے ہیں تاکہ اس ٹکڑے کا صحیح مفہوم اس کی نظیر کی روشنی میں واضح ہو جائے۔ 'اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ' کی وضاحت کرتے ہوئے ہم نے لکھا ہے:

"'اَذِلَّةٌ'، 'ذَلِيْلٌ' کی جمع ہے۔ عربی میں یہ لفظ جیسا کہ آل عمران آیت ۱۲۳ کے تحت ہم بتا چکے ہیں، اچھے اور برے دونوں معنوں میں آتا ہے۔ جب یہ اچھے معنوں میں آتا ہے، جیسا کہ یہاں ہے تو اس کے معنی نرم خو، نرم مزاج، فرمانبردار، متواضع اور سہل الانقیاد کے ہوتے ہیں۔ 'ذلول' کا لفظ بھی اسی معنی میں آتا ہے۔ فرمانبردار اونٹنی کو 'ناقۃ ذلول' کہتے ہیں۔"

"'اَعِزَّةٌ'، 'عَزِيْزٌ' کی جمع ہے۔ یہ لفظ بالکل ذلیل کے مقابل لفظ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے معنی ہیں سخت، مشکل، بھاری، ناقابل شکست، ناقابل عبور، غیر الانقیاد۔ اگر کسی چیز کے متعلق کہیں کہ 'هُوَ عَزِيْزٌ عَلَيَّ' تو اس کے معنی ہوں گے کہ وہ چیز مجھ پر بھاری اور مشکل ہے۔ اس کو رام کرنا اور قابو میں کرنا میرے لیے دشوار ہے۔"[1]

اسی ضمن میں ہم نے 'شَدِيْدٌ عَلَيَّ' کا مفہوم بھی اس طرح واضح کیا ہے۔

"یہی مفہوم 'شَدِيْدٌ عَلَيَّ' کا بھی ہوتا ہے۔ کسی حماسی کا نہایت عمدہ شعر ہے۔

اذا المرء اعیته المروة ناشئًا ۔۔۔۔ فمطلبها کهلا علیه شدید

(اگر اٹھتی جوانی میں اولوالعزمی پیدا کرنے سے آدمی قاصر رہ جاتا ہے تو ادھیڑ پن میں اس کا حاصل کرنا نہایت دشوار ہو جاتا ہے)۔

"مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے تو وہ نہایت نرم خو، بھولے بھالے، ہر پہلو سے لچک قبول کرنے والے اور ہر سانچے میں ڈھل جانے والے ہوں گے لیکن کافروں کے لیے وہ پتھر کی چٹان ہوں گے۔ وہ اگر اپنے اغراض و مقاصد کے لیے ان کو استعمال کرنا چاہیں گے تو کہیں سے انگلی دھنسانے کی جگہ نہ پا سکیں گے ...... سیدنا مسیح نے اپنے شاگردوں کو یہ ہدایت فرمائی تھی کہ کبوتر کے مانند بے آزار اور

---

[1] تدبر قرآن، جلد دوم: صفحہ ۳۱۸

سانپ کی مانند ہوشیار بنو، اس میں بھی یہی دونوں پہلو ملحوظ ہیں۔[1]

یہ امر بھی یہاں ملحوظ رہے کہ جس سیاق و سباق میں یہ سورۂ مائدہ والی آیت آئی ہے بعینہٖ اسی سیاق و سباق میں سورۃ الفتح والی آیت بھی وارد ہوئی ہے۔ وہاں ہم واضح کر چکے ہیں کہ منافقین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ ان کا کردار اسلامی کردار کے بالکل برعکس واقع ہوا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ اہلِ ایمان کے لیے نہایت سہل الانقیاد اور کفار کے لیے غیر الانقیاد ہوتے۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ کفار کے ہاتھوں میں تو وہ کھلونا بنے ہوئے ہیں لیکن مسلمانوں کو دھوکا دینے میں بڑے شاطر ہیں۔ اسی طرح اس سورہ میں بھی یاد ہو گا، منافقین کا کردار آیات ۲۔۱۸ میں تفصیل سے زیرِ بحث آیا ہے۔ آخر میں مسلمانوں کے اجتماعی کردار کا یہ پہلو اس لیے نمایاں کیا گیا ہے کہ منافقین اس آئینہ میں اپنی صورت دیکھیں کہ مسلمانوں کا کردار کیا ہونا چاہیے اور وہ کس کردار کا مظاہرہ کر رہے ہیں کہ پیغمبر اور اس کے جاں نثار ساتھیوں کے لیے تو روزِ بد کے منتظر ہیں اور کفار کو جا جا کر اطمینان دلا رہے ہیں کہ اگر مسلمانوں کی طرف سے آپ لوگوں کو کوئی خطرہ پیش آیا تو ہم آپ ہی لوگوں کا ساتھ دیں گے۔

'اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ' کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے کے باعث بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ اسلام روزمرہ زندگی کے سلوک و طرزِ عمل میں یہ چاہتا ہے کہ ہر مسلمان کا رویہ ہر غیر مسلم کے ساتھ کرخت اور بیزارانہ ہو حالانکہ یہ بات نہ قرآن کے الفاظ سے نکلتی ہے اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے طرزِ عمل سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ ہم نے الفاظ اور نظائر کی روشنی میں آیت کی جو تاویل کی ہے امید ہے کہ وہ اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے کافی ہو گی۔

خلق اور خالق دونوں کے ساتھ مربوط زندگی

'تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا' یہ ان کی توجہ الی اللہ، ان کی شب بیداری اور ان کی تہجد گزاری کی تصویر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو بھی ان کو دیکھے گا اس پر پہلی ہی نظر میں یہ بات واضح ہو جائے گی کہ دنیا کے عام انسانوں سے بالکل مختلف یہ ایسے قدسی صفت لوگوں کی ایک جماعت ہے جن کی زندگی کا اصلی نصب العین خدا کی رضا طلبی ہے۔ چنانچہ کبھی وہ ان کو رکوع میں پائے گا کبھی سجود میں۔ اوپر والے ٹکڑے میں ان کا وہ پہلو سامنے آیا ہے جس کا تعلق خلق سے ہے۔ اس ٹکڑے میں ان کی زندگی کے اس پہلو کی طرف اشارہ ہے جس کا تعلق خالق سے ہے یعنی خلق کے ساتھ بھی ان کا تعلق بالکل صحیح بنیاد پر قائم ہے کہ وہ اہلِ باطل کے مقابل میں نہایت سخت اور اہلِ حق کے لیے نہایت نرم خو ہیں اور خالق کے ساتھ بھی ان کا ربط نہایت محکم و استوار ہے کہ کسی وقت بھی وہ اس سے غافل نہیں ہوتے۔ اور اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں پسندیدہ زندگی وہی ہے جو خلق اور خالق دونوں سے بالکل صحیح بنیاد پر مربوط ہو۔

---

[1] تدبرِ قرآن، جلد دوم، صفحات ۳۱۸ - ۳۱۹

اگر اس میں کسی پہلو سے ذرا بھی خلل پیدا ہو جائے تو انسان کی ساری زندگی بے ہنگم ہو جاتی ہے۔

صحابہؓ کی ایک خاص علامتِ امتیاز

سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ - یہ ان کی خاص علامتِ امتیاز کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے چہروں پر سجدوں کے نشان نمایاں ہیں۔ الفاظ سے یہ بات صاف نکل رہی ہے کہ یہاں وہی نشان مراد ہیں جو کثرتِ سجود سے پیشانی پر پڑ جاتے ہیں اور یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ نشان بہت محبوب ہیں یہاں تک کہ وہ چاہتا ہے کہ اس دنیا کے اندر یہ امت اسی نشان سے دوسری امتوں کے مقابل میں پہچانی جائے۔ یہ ساری باتیں الفاظِ قرآن سے واضح ہیں اس وجہ سے ہم ان لوگوں کی رائے صحیح نہیں سمجھتے جنھوں نے ان الفاظ کو ان کے ظاہر معنی سے ہٹا کر ان کے مجازی معنی لینے کی کوشش کی ہے ہمیں اس امر سے انکار نہیں ہے کہ بعض لوگ محض ریا کے لیے بھی اپنی پیشانی پر گھٹا ڈالنے کی کوشش کرتے ہوں گے لیکن محض اس بنا پر کہ کچھ لوگوں کے گھٹے محض نمائشی ہوتے ہیں اہل ایمان کے اس عظیم نشانِ امتیاز کی وقعت کم نہیں کی جا سکتی۔ ریا کا امکان جس طرح اس چیز کے اندر ہے اسی طرح دین کے ہر اعلیٰ و ادنیٰ کام میں ہو سکتا ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض لوگوں کو ٹوکا کہ انھوں نے اپنی پیشانیوں پر گھٹے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کے حالات سے بہت باخبر تھے۔ اگر انھوں نے کسی شخص کو اس طرح کی کسی بات پر تنبیہ کی تو مسلمانوں کے ایک مربی و معلّم ہونے کی حیثیت سے ان کا یہ حق تھا اور اس کا ایک محل ہے۔ اس سے امت کے اس نشانِ امتیاز کی بے وقعتی نہیں ہوتی جس کا آیت زیرِ بحث میں حوالہ ہے۔

پیشین گوئیوں میں یہود کی تحریفات

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کی یہ تمثیل تورات میں بیان ہوئی ہے۔ یہ اشارہ ان پیشین گوئیوں کی طرف ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے باب میں تورات، زبور اور یسعیاہ نبی کے صحیفوں میں ہیں اگرچہ یہود نے قطع و برید کر کے ان کو بالکل مسخ کر دیا ہے اور مسخ کرنے کا یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ جن الفاظ کی نسبت بھی ان کو گمان ہو جاتا ہے کہ مسلمان ان کو اپنے حق میں استعمال کر سکتے ہیں ان پر فوراً تحریف کی قینچی چلا دی جاتی ہے۔ تاہم آج بھی تورات اور انجیل دونوں میں ایسی چیزیں موجود ہیں جن کا مصداق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ مثلاً استثنا باب ۳۳ - ۲ میں ہے:

> "خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔"

اس پیشین گوئی کا مصداق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ظاہر ہے کہ دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اس میں جبل فاران کا ذکر بھی ہے اور دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آپ کے نمودار ہونے کا صریح الفاظ میں حوالہ بھی ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں قرآن نے اس پیشین گوئی کا حوالہ مسلمانوں کے غلبہ و تمکن ہی کے پہلو سے دیا ہے اور یہ ایک مسلّم تاریخی حقیقت ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار صحابہؓ آپ کے ہمرکاب تھے۔

یہ تو صرف خدائے علّام الغیوب ہی کو علم ہے کہ اس پیشین گوئی میں کتنی تحریفیں ہو چکی ہیں لیکن ایک تازہ مثال اس میں تحریف کی یہ ہے کہ "دس ہزار قدوسیوں" کے الفاظ جو اس میں وارد ہیں اب بعض نسخوں میں بدل کر وہ "دس لاکھ" کر دیے گئے ہیں جس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ مسلمان اس کو فتح مکہ پر منطبق نہ کر سکیں۔ تاہم اس پر اچھی طرح غور کیجیے تو اس میں ان تمام باتوں کی طرف اشارہ ہے جن کا قرآن نے حوالہ دیا ہے۔

اس میں 'دس ہزار قدوسیوں' کا حوالہ ہے۔ 'قدوسیوں' سے مراد ظاہر ہے کہ پاکیزہ صفات، نیک نہاد، خدا ترس اور عبادت گزار بندے مراد ہیں۔ قرآن میں اس کی جگہ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا ..... سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ کے الفاظ ہیں۔ اب یا تو یہ ہوا ہے کہ قرآن نے تورات کے لفظ 'قدوسیوں' کو قدوسیوں کی صفات بیان کر کے اچھی طرح شناخت کرا دی ہے تاکہ اہل کتاب پہچان لیں کہ جن قدوسیوں کا ان کے صحیفوں میں ذکر آیا ہے وہ یہی لوگ ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں اور جو عنقریب دس ہزار کے لشکر کی صورت میں ظاہر ہو کر اس پیشین گوئی کی تصدیق کر دیں گے۔ یا پھر یہ ہوا ہے کہ تورات میں بھی یہ تمام صفات بیان ہوئی ہوں لیکن یہود نے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق دوسری پیشین گوئیوں کو چھپانے کی کوشش کی اسی طرح یہاں بھی تمام صفات کو غائب کر کے 'قدوسیوں' کا لفظ رکھ دیا تاکہ اس کی تاویل اپنے منشا کے مطابق کر سکیں۔ امکان ان دونوں ہی باتوں کا ہے لیکن کوئی منصف اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ تورات کی اس پیشین گوئی کے مصداق ہو سکتے ہیں تو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ ہی ہو سکتے ہیں۔

دوسری خاص بات جو اس پیشین گوئی میں ہے وہ یہ ہے کہ "اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی"۔ "آتشی شریعت" ہمارے نزدیک تعبیر ہے اس مضمون کی جو قرآن میں أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ اس کی وضاحت حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے الفاظ میں یوں فرمائی ہے کہ "اس کے ہاتھ میں (یعنی پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں) اس کا چھاج ہو گا، وہ اپنے کھلیان کو خوب صاف کرے گا، دانے کو بھس سے الگ

کرے گا، پھر دانے کو محفوظ کرے گا اور بھس کو جلا دے گا۔"

یہی حقیقت حضرت مسیح علیہ السلام نے دوسرے الفاظ میں یوں بیان فرمائی ہے:

"جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا...... اسی لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا لیکن جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔" متی باب ۲۱: ۴۲-۴۴

کتاب استثنا کی مذکورہ بالا پیش گوئی میں یہ الفاظ بھی ہیں:

"وہ بے شک قوموں سے محبت رکھتا ہے۔ اس کے سب مقدس لوگ تیرے ہاتھ میں ہیں اور وہ تیرے قدموں میں بیٹھے ایک ایک تیری باتوں سے مستفیض ہو گا۔"

خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اگرچہ ترجمہ نے کلام کے رُخ کو مبہم بنا دیا ہے تاہم یہ وہی بات فرمائی گئی ہے جس کا سراغ قرآن نے تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا کے الفاظ میں دیا ہے۔

انجیل کی تمثیل کا حوالہ

وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ: تورات کی تمثیل کے بعد یہ انجیل کی تمثیل کا حوالہ ہے۔ تورات کی تمثیل میں اہل ایمان کے زہد و تبتّل، ان کے غلبہ و تمکّن اور امتوں کے ساتھ ان کے عدل اور رحم کی تصویر ہے۔ انجیل کی تمثیل میں ان کے تدریجی ارتقاء کو نمایاں فرمایا گیا ہے کہ ان کی ابتدا، اگرچہ نہایت کمزور ہو گی لیکن بالآخر وہ ایک ایسے تناور درخت کی شکل اختیار کریں گے کہ ان کے سایہ میں بڑی بڑی قومیں پناہ لیں گی۔ متی باب ۱۳: ۳-۹ میں یہ تمثیل یوں بیان ہوئی ہے:

"اس نے ایک اور تمثیل پیش کر کے کہا کہ آسمان کی بادشاہی اس رائی کے دانے کی مانند ہے جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بو دیا۔ وہ سب بیجوں سے چھوٹا تو ہے لیکن جب بڑھتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا اور ایسا درخت ہو جاتا ہے کہ ہوا کے پرندے آ کر اس کی ڈالیوں میں بسیرا کرتے ہیں۔"

یہ تمثیل معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ مرقس باب ۴ اور لوقا باب ۸ میں بھی آئی ہے۔ اسی تمثیل کی قرآن نے یوں وضاحت فرمائی کہ جو حال کھیتی کے نشو و نما کا ہوتا ہے وہی حال اسلام کے تدریجی عروج و کمال کا ہو گا، کھیت میں جو دانے بوئے جاتے ہیں اوّل اوّل وہ باریک سوئیاں سی نکالتے ہیں پھر ان کو مزید سہارا ملتا ہے جس سے سوئیاں موٹی اور قوی ہو جاتی ہیں اور کھیتی اپنے تنہ پر

کھڑی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک دن آئے گا کہ جو تخمِ حق عرب کی سرزمین میں بویا گیا ہے اس کی فصل شباب پر آئے گی جو اپنے بونے اور آبیاری کرنے والوں کے دلوں کو تو موہ لے گی اور ساتھ ہی ان لوگوں کے دلوں کو غم و غصہ سے جلائے گی جنھوں نے اس کے نشو و نما کو روکنے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔

'لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ' میں 'ل' غایت و انجام کے اظہار کے لیے ہے اور لفظ 'کفار' تمثیل کے اصل مفہوم پر روشنی ڈال رہا ہے۔ تمثیل میں یہاں مراد چونکہ اہل ایمان ہیں اس وجہ سے آخر میں یہ ظاہر کر کے کہ ان کا عروج بالآخر ایک دن کفار کے لیے باعث حسرت و حسد ہوگا گویا اس تمثیل کے ممثل کو ظاہر کر دیا۔ عربی زبان میں تمثیلات و استعارات کے اندر یہ طریقہ معروف ہے کہ آخر میں کسی لفظ کے ذریعہ سے تمثیل یا استعارے کے ممثل یا مستعارلہٗ کو واضح کر دیتے ہیں تاکہ اصل مدعا واضح ہو جائے۔ سورۂ نور والی تمثیل میں اس کی نہایت واضح مثال موجود ہے۔

'وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا'

یہ آخر میں اسی وعدۂ نصرت و مغفرت کی بشارت ہے جس کے اثبات کے لیے تورات و انجیل کی پیشین گوئیوں کا حوالہ دیا گیا ہے کہ جو لوگ ان صفات کے مصداق اور ایمان و عمل میں پختہ و راسخ رہیں گے اللہ تعالیٰ ان کو مغفرت اور اجرِ عظیم سے نوازے گا۔ رہے وہ لوگ جو ایمان کے مدعی تو بن بیٹھے لیکن ان کی ہمدردیاں اللہ و رسولؐ سے زیادہ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ ہیں اور جنھوں نے حدیبیہ کے موقع پر وہ کمزوری دکھائی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو وہ اس انجام سے دوچار ہوں گے جو اسلام کے مخالفوں کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مدد سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہ۔

رحمان آباد
یکم نومبر ۱۹۷۶ء
۸۔ ذی قعدہ ۱۳۹۶ھ